ہماری رسمیں

ڈاکٹر نریش

ہماری رسمیں

ہماری رسمیں

ڈاکٹر نریش

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۵۴۱

ہماری رسمیں

سنہ اشاعت	:	۲۰۰۵ء
قیمت	:	۸۵/= روپے
کمپوزنگ	:	محمد ساجد، انجمن ترقی اردو (ہند)
بہ اہتمام	:	اختر زماں
طباعت	:	ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

Hamari Rasmein

by : Dr. Naresh

2005

Rs. 85/=

I S B N : 81-7160-123-5

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

Urdu Ghar : 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002

Contact : 23237210, 23236299, Fax : 23239547

http\\www.anjuman-taraqqi-urdu-hind.com

E-mail : urduadabndli@bol.net.in

ترتیب

حرفِ آغاز

ہندوستان ایک وسیع اور عریض ملک ہے۔اس لیے یہاں تہذیب کی کثرت اور رنگارنگی ہے۔مختلف علاقوں میں مختلف انداز کے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔مختلف دیوتاؤں کی پوجا ہوتی ہے۔مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔مختلف تہذیبی اقدار ہیں لیکن رنگارنگی اور کثرت کے باوجود ان سب میں کچھ ایسی قدریں مشترک ہیں کہ سب الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک ہیں۔ اس وحدت میں کثرت اور رنگارنگی تہذیب کی سب سے بڑی مظہر اردو زبان ہے جو ہندوستان کو ہندایرانی تہذیب کی سب سے بڑی دین ہے۔

صوفیاے کرام اور ہندو بزرگوں اور صوفیوں نے جس انسان دوستی اور مذہبی رواداری کی تعلیم دی تھی اس کا پورا عکس اردو شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے۔بے شمار مسلمان شعرا نے رام چندر جی، کرشن جی، گوتم بدھ، مہاویر سوامی اور دوسرے غیر مسلم پیغمبروں اور بزرگوں پر نظمیں لکھیں۔اسی طرح غیر مسلم شعرا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علیؓ، حضرت امام حسینؓ اور دوسرے مسلم رہنماؤں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

اردو شاعری نے ہمیشہ ہی انسان دوستی اور مذہبی رواداری کی تبلیغ کی۔دیروحرم کی تفریق کو تسلیم نہیں کیا۔شیخ اور برہمن کی ظاہرداریوں کا مذاق اُڑایا۔ملک اور قوم سے محبت کے گیت گائے۔

یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں نے ہندوستان کی تہذیب اور یہاں کے رسم و رواج کو متاثر نہ کیا ہو اور یہاں کی تہذیب سے خود بھی متاثر نہ ہوئے ہوں۔۔۔ ہندوستان کے کھانوں، آداب و اطوار، رہن سہن اور لباس وغیرہ پر باہر سے آنے والے مسلمانوں اور خاص طور سے مغلوں کا گہرا اثر ہے۔ مسلمانوں کی فکر، ان کے رسم ورواج اور زندگی کے مختلف شعبے یہاں کی زندگی سے متاثر ہوئے۔اس طرح ایک ایسی تہذیب وجود میں آئی جسے ہندو مسلم مشترکہ تہذیب یا دوسرے لفظوں میں ہندایرانی تہذیب کہا جاتا ہے۔اس

مشترکہ تہذیب کی تشکیل میں ہندوستان کے اُن مقامی باشندوں کو زیادہ دخل ہے، جنھوں نے مذہب اسلام قبول کیا۔ اُن رانیوں کا بہت بڑا یوگدان ہے، جنھوں نے مغل بادشاہوں سے شادیاں کیں۔ نومسلموں نے اپنے بیشتر رسم و رواج برقرار رکھے۔ صرف اتنا ہوا کہ ہندو رسموں میں سنسکرت کے جو اشلوک پڑھے جاتے تھے، انھیں قرآن کی آیتوں سے بدل دیا گیا، جس کی بہت سی مثالیں مولوی سید احمد دہلوی کی 'رسومِ دہلی' میں ملیں گی۔

موت کے تیسرے روز ہندوؤں میں تیجا ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے یہ رسم ہندوؤں سے لی ہے اور اس کا نام پھول یا فاتحۂ سوم رکھا ہے۔ اس موقع پر ہندوؤں میں سنسکرت کے اشلوک پڑھے جاتے ہیں اور مسلمانوں میں چنوں پر قرآن شریف پڑھا جاتا ہے۔ اس رسم کی پوری تفصیل سید احمد دہلوی صاحب نے اپنی کتاب میں پیش کی ہے۔ ہندو دھرم کی بہت سی رسموں کا مسلمانوں نے بدل پیدا کیا۔ قبر پرستی اور نذر و نیاز بھی ہندو دھرم ہی کی دین ہے۔ غرض یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بیشتر رسمیں ہندوؤں سے لی ہیں۔

شاہِ عالم سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک بعض ہندو تہوار مثلاً راکھی، ہولی، دیوالی اور دسہرہ وغیرہ قلعے میں باقاعدگی سے منائے جاتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آدابِ تخت کے پاس و لحاظ میں اُن شہزادوں کی ختنہ نہیں کرائی جاتی تھی جو تخت کے حق دار ہو سکتے تھے۔ ہندو دھرم کی بہت سی رسموں اور روایتوں کا مسلمانوں کے رسم و رواج پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ بعض ایسی روایتیں، جن کا تعلق سو فی صدی ہندو دھرم کے ماننے والوں سے تھا، مسلم رسم و رواج کا بھی حصہ بن گئیں۔ مثلاً ہندوؤں کے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ایسے گیت گائے جاتے ہیں، جن میں کرشن جی کی ولادت کا ذکر ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں بھی ولادت کے موقع پر یہی جچا گیریاں گائی جاتی تھیں۔ ہم نے کچھ عرصے پہلے تک وہ جچا گیریاں سنی تھیں، جنھیں سید احمد دہلوی نے نقل کیا ہے۔ مثلاً اس جچا گیری میں:

البیلے نے مجھے درد دیا سانولیا نے مجھے درد دیا

البیلے اور سانولیا سے مراد کرشن جی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں اور خاص طور سے مغلوں نے نہ صرف ہندو رسم و رواج اپنائے، بلکہ اسی انداز پر کچھ نئی رسموں کو بھی جنم دیا گیا یا ہندوستان سے باہر کی بعض رسموں کو شامل کیا گیا۔ مثلاً ''بچہ بگیر'' کی رسم ہندوستانی نہیں بلکہ بہ قول سید احمد دہلوی ترکی الاصل ہے۔ اس رسم کے علاوہ بچہ پیدا ہونے کی تمام رسمیں ہندوستانی ہیں اور ہندو اور مسلمان دونوں میں مشترک

ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صحنک کی رسم شاہ جہاں کی والدہ جودھا بائی کی ایجاد ہے۔ اس رسم کی دل چسپ تفصیل سیّد احمد دہلوی نے بیان کی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں نے ہندوستان کے بعض ایسے رسم و رواج بھی اپنا لیے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھے۔ مثلاً اسلام نے بیوہ کی شادی پر بہت زور دیا ہے لیکن ہندوستان میں بیوہ کی شادی کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے بھی اس روایت کو اپنا لیا۔ بڑے شہروں میں تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ لعنت کم ہوتی جارہی ہے لیکن دیہی علاقوں میں اب بھی کافی حد تک برقرار ہے۔

سہاگن اور بیوہ کے ساتھ سماج کا ہندوستان میں جو رویہ ہے وہ سو فی صدی ہندوستانی ہے۔ بعض رسموں میں صرف سہاگنیں شریک ہوسکتی ہیں۔ شادی اور خوشی کی بہت سی رسموں کے موقع پر بیواؤں کو دور رکھا جاتا ہے، اکثر مسلم گھرانوں کا بھی سہاگنوں اور بیواؤں کے ساتھ وہی رویہ ہے، جو ہندوؤں کا ہے۔ تعلیم اتنی عام ہونے کے باوجود بیواؤں کے ساتھ یہ ظلم آج بھی ہوتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کے تقریباً تمام رسم و رواج ہندوستان ہی میں وجود میں آئے ہیں اور ہندوؤں سے لیے گئے ہیں۔

سیّد احمد دہلوی نے اپنی کتاب 'رسومِ دہلی' کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے۔

> "پہلے اس سے کہ میں ان رسموں کو شروع کروں اس قدر عرض کر دینا مناسب جانتا ہوں کہ مسلمانوں کی عورتوں اور ان کے سبب ان کے مردوں میں جس قدر رسمیں مرّوج ہیں وہ تقریباً سب کی سب ہندو رسمیں ہیں جن میں سے بہت سی رسمیں تو جوں کی توں ہیں مگر طریقے بدل گئے ہیں۔ بعض میں برائے نام فرق کر دیا ہے۔ بعض کو مذہبی امور میں بہ تغیرِ نام شامل کر لیا۔ مثلاً رسمِ تیجا ہندوؤں میں، فاتحۂ سوم یا پھول مسلمانوں میں۔"

علمِ سماجیات کی روشنی میں رسم و رواج کے بارے میں چند باتیں کہنی ضروری ہیں۔ رسموں کو ہم تین حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱- مذہبی

۲-سیکولر

۳-مذہبی سیکولر

۱- مذہبی رسوم وہ ہیں، جن کا تعلق کسی مذہب سے ہوتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں میں نکاح، ولیمہ، بچوں کے کان میں اذان دینا، عقیقہ، ختنہ، نماز، روزہ، فاتحہ سوم اور چالیسواں وغیرہ مذہبی رسمیں ہیں۔

۲- سیکولر رسمیں۔ ستوانسا، نوماسا، سردان، رتجگہ، رقعہ، منگنی، مائیوں بٹھانا، ابٹنا کھیلنا، ساچق، مہندی لگانا، برات، چوتھی، چالے وغیرہ یہ وہ رسمیں ہیں جن میں مذہب کو دخل نہیں، یہ سماجی رسوم ہیں۔ بات بھیجنے اور رقعے کے علاوہ تمام رسوم ہندوؤں سے لی گئی ہیں۔

۳- مذہبی سیکولر۔ تیسری طرح کی رسمیں وہ ہیں جو بنیادی طور پر سیکولر ہیں۔ لیکن قرآن شریف رکھ کر یا قرآن شریف کی بعض آیتیں پڑھ کر ان پر تھوڑا سا مذہبی رنگ چڑھا دیا گیا ہے۔ مثلاً گھوڑی چڑھانے کی رسم ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں تھی، ہندو بچے کو گھوڑی پر بٹھا کر مندر اور مسلمان مسجد یا درگاہ لے جاتے ہیں۔ بسم اللہ ایک ایسی رسم ہے جس میں بچے کی تعلیم کا آغاز کیا جاتا ہے۔ بچے سے پہلے بسم اللہ پڑھوائی جاتی ہے اور پھر ''اقراء باسم ربک الذی خلق'' کے الفاظ کہلوائے جاتے ہیں۔ مونچھوں کے کونڈوں میں آنحضرت کے نام کی نیاز دلواتے ہیں۔ آرسی مصحف میں دولہا دلہن کے درمیان قرآن شریف رکھ دیا جاتا ہے۔ غرض یہ رسوم سیکولر ہیں لیکن ان کو معمولی سا مذہبی رنگ بھی دے دیا گیا ہے۔

ہماری بیشتر رسوم وہ ہیں جو اُس وقت سے رائج ہیں جب سے انسان نے سماجی زندگی کا آغاز کیا۔ کوئی ایک بھی رسم ایسی نہیں ہے، جو بے وجہ ہو۔ ہر رسم کی بنیاد کسی نہ کسی مقصد پر ہے۔ اس لحاظ سے رسوم کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱-سماجی رسوم

۲-مذہبی رسوم

۳-نفسیاتی رسوم

۱- سماجی رسوم: جب سے سماج میں فرد کوئی نئی حیثیت اختیار کرتا ہے تو کچھ رسوم کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ یہ رسوم فرد کی نئی حیثیت کا اعلان کرتی ہیں۔ مسلمانوں میں نکاح اور ہندوؤں میں پھیرے غیر شادی شدہ افراد کا شادی شدہ ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ تمام مذاہب میں شادی کے مقابلے میں مرد کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے بیشتر سماجی رسوم بیٹے، شوہر اور باپ کے لیے ہیں۔ ہندوؤں میں ''اُپ نینا'' یعنی جنیو پہنانے کی باقاعدہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس رسم کا مقصد یہ اعلان ہے کہ بچے نے جوانی میں قدم رکھ لیا ہے۔ بسم اللہ، ہدیہ، آمین، مونچھوں کا کونڈا اور پگڑی باندھنا وغیرہ اسی طرح کی سماجی رسوم ہیں۔ ہندوستانی سماج میں لڑکوں اور لڑکیوں کے آزادانہ اختلاط پر ہمیشہ پابندی رہی ہے۔ لیکن بعض رسوم ایسی ہیں جن میں کچھ دیر کے لیے یہ پابندی ختم کردی جاتی ہے ابٹنا کھیلنے اور چوتھی میں ایک دوسرے پر پھول اور پھل مارنے اور ہندوؤں میں ہولی کھیلنے کی رسموں کا یہی مقصد ہے۔

۲- مذہبی رسوم: نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور اس طرح کی دوسری رسوم کا مقصد سماجی برائیوں سے بچنا اور ذہنی آسودگی حاصل کرنا ہے۔

۳- نفسیاتی رسوم: جب فرد کی شادی ہوتی ہے یا بچہ پیدا ہوتا ہے یا کسی کا انتقال ہوتا ہے تو ان تینوں صورتوں میں فرد کے ذہن پر ان واقعات کا گہرا اثر ہوتا ہے شادی کی رسمیں اس لیے ہوتی ہیں کہ لڑکا اور لڑکی اپنے نئے رشتے داروں سے اچھی طرح واقف ہو جائیں اور نئی ذمے داریوں کے لیے تیار ہو جائیں۔ چوں کہ شادی کا اثر لڑکی کے ذہن پر زیادہ ہوتا ہے، اس لیے اُس کے لیے زیادہ رسمیں ہوتی ہیں، چوتھی، چالے اور شادی کے بعد دوستوں اور عزیزوں کی طرف سے دعوتوں کا مقصد یہی ہوتا ہے۔

کہ دولہا دلہن اپنے نئے رشتے داروں سے مل کر بے تکلف ہو سکیں۔

بچہ پیدا ہوتا ہے تو ماں اور باپ دونوں کی نئی ذمہ داری شروع ہوتی ہے ماں باپ کو اس نئے رول کے لیے تیار کرنے کے لیے بہت سی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ پہلا بچہ پیدا ہونے سے پہلے ماں ایک فطری خوف کا شکار ہوتی ہے۔ گود بھرائی، ستوانسا اور نوماسا جیسی رسوم سے اس خوف میں کچھ کمی آجاتی ہے۔

کسی عزیز کی موت کے بعد جو رسمیں ادا کی جاتی ہیں، وہ بھی ذہنی سکون کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

غرض یہ ہے کہ یہ رسمیں ہمارے ذہنوں کی آسودگی کا سامان فراہم کرتی ہیں اور نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔ غیر یقینی حالات میں ہمارے دل و دماغ کو صبر و سکون پہنچاتی ہیں۔ بعض رسوم تفریحِ طبع اور انسان کا دل بہلانے کے لیے ادا کی جاتی ہیں۔

نریش صاحب نے ہندوستان کے مختلف مذاہب کے لوگوں کے سماجی اور مذہبی رسومات کی تفصیلات بہت محققانہ اور عالمانہ انداز میں بیان کی ہیں۔ رسم و رواج پر ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر اس موضوع پر نریش صاحب کی زیرِ نظر کتاب مختصر لیکن بہت جامع ہے۔ میری تجویز ہے کہ اس کتاب کا انگریزی کے علاوہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ علمِ سماجیات کی یہ ایک اہم کتاب ہے۔

خلیق انجم

ابتدائیہ

رسم و رواج کسی بھی معاشرے کا بیش قیمت تہذیبی سرمایہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کی تاریخ اور اس کے تاریخی ارتقا کی پہچان بھی ہوتے ہیں۔ رسومات کے آئینے میں کسی معاشرے کے خط و خال ہی کو نہیں بلکہ اس کے تحت الشعور کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ رسومات نظمِ معاشرہ میں بھی معاون ہوتی ہیں اور ان کے ذریعے معاشرتی وتیرے کا توازن بھی قائم رکھا جاتا ہے۔

کسی بھی معاشرے میں ایسی کوئی رسم رائج نہیں ہے جو بلاوجہ ہی شروع ہوگئی ہو۔ ہر رسم کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی ایسی ضرورت موجود ہے جس کے لیے کسی عمل کو رسم کی صورت عطا کرنا لازمی ہوگیا تھا۔ مقامِ افسوس ہے کہ ہماری موجودہ نسلیں اپنی اس بیش قیمت وراثت سے بیخبر ہوتی جارہی ہیں۔ موجودہ معاشرے میں اکثر رسومات لوک لاج کی وجہ سے ہی ادا کی جاتی ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی، لوگ اپنے اندر گہرے اترے ہوئے تقدس کی وجہ سے، روایت کے طور پر اکثر رسومات ادا کرتے چلے جارہے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان رسومات کی اہمیت اور ان کی مقصدیت کو سمجھا جائے۔ ان رسومات کو پھر سے مروّج کیا جائے جن کی افادیت مسلمہ ہے اور ان رسومات کو خیرباد کہا جائے جو وقت کے تغیر کے ساتھ اپنی افادیت کھوچکی ہیں۔

مثال کے طور پر، ہندو معاشرے میں شادی کے موقع پر فرس نشینی اور اس سے متعلق دیگر رسومات کو بہت دھوم دھام کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے لیکن شاید ہی لوگوں کو معلوم ہو کہ منو نے اس طرح سے ہونے والی شادی کو ''راکشس وِواہ'' یعنی عفریتی شادی قرار دیا تھا۔ مہذب ہندو معاشرے میں شادی کی جو صورت قابلِ قدر اور قابلِ تحسین جانی گئی، اس کے مطابق آگ کو گواہ بنا کر دلہن کو شریکِ حیات بنایا جاتا ہے۔ اسی کو منو نے خدائی شادی یا براہم وِواہ قرار دیا ہے۔ موجودہ ہندو معاشرہ خدائی شادی کو تو بیکار سمجھنے لگا ہے مگر عفریتی شادی سے اس کا تعلق دن بدن مضبوط ہوتا جارہا ہے۔ یہاں پر ایک خاص اندازِ فکر کا ہونا درکار ہے جو ان رسومات کے گہرے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

معاشرتی ارتقا کے متعدد مراحل کو سمجھنے کے لیے بھی رسومات کے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔رسومات کا مطالعہ ہمیں اس ابتدائی دور تک لے جاتا ہے جہاں سے ان رسموں نے اپنے سفر کی ابتدا کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرتی مطالعے میں رسم و رواج کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا گیا ہے۔

ہندوستان میں، ہندوؤں کے علاوہ سکھوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی تعداد بھی خاصی بڑی ہے۔ان میں سے سکھ معاشرہ تو ہندو معاشرے کا ہی مُظہر روپ ہے۔ مسلم اور عیسائی معاشرے میں بھی اکثریت ان کی ہے جنھوں نے ہندو دھرم کو ترک کر کے اسلام یا عیسائیت قبول کی تھی۔ یہ لوگ جن رسومات کو اپنے ساتھ لے گئے تھے، ان سے اسلامی یا عیسائی رسومات کا متاثر ہونا ایک قدرتی عمل تھا۔لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوستانی عیسائیوں کے ساجی وتیرے کو سمجھنے کے لیے توازن کے اس مقام تک پہنچنا ضروری ہے جہاں ان کے اجداد نے ہندوستانیت کی کتاب میں ایک نئے اور اہم باب کا اضافہ کیا تھا۔

اس کتاب کی مدد سے اگر میرے قارئین اپنے عظیم تہذیبی ورثے کی پہچان کرسکیں اور مختلف معاشروں کے باہمی لین دین کے فطری عمل کو مدِ نظر رکھ کر تحمل، رواداری اور بردباری جیسے اوصاف کی اہمیت کو قبول کرسکیں تو میں اپنی محنت کو کامیاب سمجھوں گا۔

نریش

پروفیسر وصدر،
شعبۂ جدید ادب،
پنجاب یونی ورسٹی،
چنڈی گڑھ-۱۶۰۰۱۴

اُن سب کے نام
جو رسموں کو بے معنی سمجھتے ہیں

باب-۱

رسومات---اساسی پس منظر

اپنے غم اور اپنی خوشی کو دوسروں کے ساتھ بانٹنا فطرتِ انسانی ہے۔ مسرّت یا اندوہ کے جذبے کو اپنی ذات تک محدود رکھنا عام آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ وفورِ خوشی سے، 'انسان تنہا ہونے پر' دیواروں سے، اپنے گرد و پیش کی چیزوں سے حتیٰ کہ اپنے آپ سے گفتگو کرتے ہوئے ناچ اُٹھتا ہے۔ مسرت کا جذبہ اس وقت تک اس کے خط و خال سے نمایاں رہتا ہے جب تک وہ کسی دوسرے کو اپنی خوشی میں شریک نہیں کر لیتا۔ اسی طرح دوسروں کو اپنے رنج و غم میں شریک کرنا بھی انسانی نفسیات کا ایک اہم پہلو ہے۔ پرانی ضرب المثل ''کہ کہنے سے دکھ کم ہو جاتا ہے۔'' ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اپنے اندر بھرے ہوئے غم و اندوہ کے جذبے سے نجات پانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے دکھ کو اشاروں، لفظوں یا گریہ وزاری کے ذریعے کم کر لیا جائے۔

رسموں کی ابتدا

ابتدائی انسان نے اپنے غم و الم کو اشاروں کنایوں کے ذریعے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بانٹا ہوگا۔ زبان کے وجود میں آنے پر، انسان نے لفظوں کے ذریعے دوسروں کو اپنے غم میں شریک کرنا شروع کیا ہوگا۔ نظمِ معاشرہ کے عہدِ طفلی ہی میں غم اور خوشی کو بانٹنے کے کچھ طریقے وضع کیے جانے لگے ہوں گے۔ رفتہ رفتہ ان طریقوں کا رواج عام ہو گیا ہوگا اور بعض ایسی رسومات ظہور میں آگئی ہوں گی جن کے ذریعے دوسروں کو اپنے غم یا اپنی خوشی میں شریک کرنا زمانے کا چلن بن گیا ہوگا۔ ازاں بعد یہ رسومات مذہبی کتابوں میں داخل ہو کر تقدیس کی حامل ہو گئی ہوں گی اور ان کی ادائیگی کو مذہبی فرائض کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ 'رسم' لفظ

کے معانی ریت، رواج، چلن، میل جول، وتیرہ، دستور، قاعدہ، قرینہ، طریقہ، برتاؤ، عادت، تقدیس، قانون وغیرہ کیے گئے ہیں۔

لفظِ رسم کے مندرجہ بالا مترادف الفاظ پر غور کیا جائے تو اس لفظ کے سہ پہلو معانی آشکار ہوتے ہیں۔

(۱) ریت، رواج، روایت، چلن، دستور، قاعدہ، قرینہ، طریقہ سے مراد یہ ہے کہ خوشی یا غم کو مروج طریقے ہی سے دوسروں کے ساتھ بانٹا جائے۔

(۲) وتیرہ، برتاؤ، میل جول وغیرہ سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کو اپنے غم اور اپنی خوشی میں شریک ضرور کیا جائے۔

(۳) تقدیس سے مراد یہ ہے کہ خوشی اور غمی دونوں صورتوں میں ماحول کو پاکیزہ رکھا جائے۔

یہ تینوں پہلو انسان کی انفرادی اور اجتماعی نفسیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جیسا پہلے بیان کیا گیا ہے کہ دوسروں کو اپنے غم اور اپنی خوشی میں شریک کرنا انسان کی فطرت بھی ہے اور اس کی مجبوری بھی، کسی انفرادی عمل کو قبولیت دے کر جب اس عمل کو معاشرے کا چلن بنایا گیا تھا تب معاشرے کی دو اہم ضروریات اس کا سبب بنی تھیں۔ یہ تھیں۔۔ ساتھیوں کی ضرورت اور مالی امداد کی ضرورت۔ ''ایک اکیلا دو گیارہ'' کے ضرب المثل کے مصداق، کسی بھی ضرورت کے وقت جب ایک انسان کو دوسرے انسان کا سہارا ملتا ہے تو اس کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ ابتدائی زمانے میں بچّے کی پیدائش کے وقت یا کسی کے فوت ہونے پر سنگی ساتھیوں کی امداد کی ضرورت بے طرح محسوس ہوئی ہوگی۔ اسی ضرورت نے ابتدائی انسان کو آس پاس رہتے ہوئے لوگوں کے ساتھ بھائی چارا قائم کرنے پر مجبور کیا ہوگا اور اسی سے انسانی معاشرے کی تعمیر شروع ہوئی ہوگی۔

سماجی پس منظر

تہذیب کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے ابتدائی انسانی معاشرے میں مالی امداد کا پہلو بھی بڑا اہم پہلو رہا ہے۔ بچہ پیدا ہونے پر اس کے لیے زیادہ دودھ اور اس کی ماں کے لیے بہتر خوراک کی

ضرورت کا پیدا ہونا قدرتی تھا۔اسی طرح مردے کی مٹی ٹھکانے لگانے کے لیے جو طور طریقے وضع ہو گئے تھے ان کے لیے بھی بعض ایسی چیزوں کی ضرورت پیش آتی تھی جو روزمرّہ کی زندگی میں کم استعمال ہوتی تھیں۔نتیجے کے طور پر ابتدائی سماج میں اشیاء کا لین دین شروع ہوا۔اس سے ہر آدمی کو ضرورت کے وقت حاجت کی چیزیں مہیا ہونے لگیں۔جیسے جیسے معاشرہ مہذب ہوتا گیا، چیزوں کی جگہ پیسوں کا لین دین جاری ہوتا گیا۔رفتہ رفتہ پیسوں کا لین دین شگون یا سلامی کے نام سے جانا جانے لگا اور یہ رواجِ عام ہو گیا۔

ہمارے تمام رسم و رواج میں پیسوں کا لین دین، درحقیقت، ایک طرح کی تنظیمِ معاشرہ ہے۔ ہر شخص، عمر بھر اپنے بھائی چارے میں شگون سلامیاں دیتا رہتا ہے اور جب اس کے ہاں کوئی خوشی یا غمی کا موقع ہوتا ہے تو بھائی چارا، وہی روپیہ اسے لوٹا دیتا ہے۔مثال کے طور پر لڑکی کی شادی پر ہونے والے اخراجات کا بوجھ متعلقہ سماج اس طرح سے بانٹتا ہے کہ ہر شخص لڑکی والوں کو کچھ نہ کچھ روپیہ پیسہ بطور شگون دیتا ہے۔یہ روپیہ پیسہ دراصل وہی روپیہ پیسہ ہے جو لڑکی کے والد نے سماج میں ہوئی دوسری شادیوں پر مختلف گھروں میں دیا ہوتا ہے۔مالی امداد حاصل کرنے کے احساسِ کمتری سے بچنے کے لیے سماج نے اسے باعزت شکل دے کر ایک رسم بنالیا۔اس رسم کے تحت نہ تو شگون دینے والا ہی یہ سوچتا ہے کہ وہ کسی پر احسان کر رہا ہے اور نہ شگون لینے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ خیرات لے رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس رسم کو ''دستوری''

یا ''بھائیوں کی بھانجی'' کہا جاتا ہے۔دوسرے لفظوں میں ہم اسے ''سماجی بینکنگ سسٹم'' بھی کہہ سکتے ہیں۔

نفسیاتی پس منظر

روپے پیسے کے لین دین کے علاوہ اپنے غم اور اپنی خوشی میں دوسروں کو شریک کرنا بھی ایک فطری عمل اور انسانی نفسیات کا ایک اہم پہلو ہے۔کسی کے گھر میں ہونے والی موت کا صدمہ، تعزیت کو آنے والے ہر شخص کو، مرگ کی تفصیل سناتے سناتے کم ہو جاتا ہے۔''مرنے والے کو کیا ہوا تھا؟'' یا ''یہ سب کیسے ہوا؟'' ماتم پرسی کے لیے آنے والے ہر شخص کا سیدھا سا سوال ہوتا ہے۔اس کے جواب میں بار بار مرگ کی تفصیل کو دہراتے دہراتے پسماندگان کے دل کا غبار نکلتا چلا جاتا ہے اور ان کا سوگ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ایسے مواقع پر، احباب و اقربا کو

اپنے غم میں شریک دیکھ کر پسماندگان کا اکیلے پڑ جانے کا احساس بھی زائل ہو جاتا ہے۔

رسم و رواج کے پس منظر میں کارفرما نفسیات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ گھر اور آس پاس کے ماحول کو پاک کیا جائے۔ پاکیزگی کا احساس مہذب انسان کا فطری احساس ہے۔ ہندو 'ہون' کے ذریعے، مسلمان 'تلاوتِ قرآن' کے ذریعے، سکھ 'گورو گرنتھ صاحب کے پاٹھ' کے ذریعے اور عیسائی 'بائبل کی تلاوت' کے ذریعے اپنے ماحول کو پاک ہوا محسوس کرتے ہیں۔ پاکیزگی کے احساس کے ساتھ پانی کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ چوں کہ پانی جسم کا میل اتارتا ہے، کپڑوں کے میل کو صاف کرتا ہے اور گندی جگہ کو دھو کر صاف کرتا ہے اس لیے پانی کے ساتھ پاکیزگی کی نسبت ایک قدرتی نسبت ہے۔ یہی وجہ ہے اکثر ہندوستانی رسوم میں پانی کا استعمال لازمی قرار پایا ہے۔ اپنے آس پاس پانی کا چھینٹا دے کر، اشنان کر کے، دھلے ہوئے کپڑے پہن کر یا کسی مقدس مقام پر نہانے سے لوگ خود کو پاک ہوا محسوس کرتے ہیں۔

جغرافیائی پس منظر

انسانی معاشرے کے رسم و رواج کو مختلف علاقوں کے جغرافیائی حالات بھی متاثر کرتے ہیں۔ ہندوستان میں چوں کہ پانی کی فراوانی ہے اس لیے یہاں کی ہر رسم میں اشنان کو شامل کر دیا گیا۔ مقدس مقامات پر جا کر مخصوص ندیوں، تالابوں میں اشنان کرنا بھی اسی لیے ممکن تھا کہ ہندوستان میں بہت سی ندیاں اور تالاب موجود ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی معاشرہ کو دیکھیے۔ عرب کے ریگ زاروں میں پیدا ہوئے اسلامی معاشرے کے لیے پانی کے کھلے استعمال کا تصور ہی ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا مسلم معاشرے میں پانی پاکیزگی کی علامت نہیں بن سکا۔ مذاہب کے تعلق سے ہم جن علامتوں اور اشارتوں کو بڑے ادب کے ساتھ مذہبی عقائد سے منسلک کرتے ہیں، ان کے پس منظر میں بھی جغرافیائی حالات ہی کارفرما نظر آتے ہیں۔ مثلاً اسلام میں سبز رنگ کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ اکثر اسلامی ممالک کے پرچم سبز رنگ ہی کے ہیں۔ وجہ صاف ہے کہ ریگستان میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے، اسلامی معاشرے کے نزدیک ہریالی کا منظر انتہائی مسرت بخش ہوتا تھا۔ ریگزار میں ہماری آنکھ سبزہ دیکھنے کو ترسی ہوئی ہوتی ہے۔ عربوں کو جہاں کہیں بھی ہریالی دکھائی دیتی تھی، وہاں پانی کا چشمہ اور کھجور کے درخت ضرور ہوتے تھے۔ کھانے کے لیے خرما اور پینے کے لیے پانی عطا کرنے والے سبزے

کے لیے عرب معاشرے کے دل میں مخصوص مقام کا ہونا قدرتی تھا۔ نتیجتاً اسلامی تمدن میں سبز رنگ دوسرے تمام رنگوں پر فوقیت حاصل کر گیا۔ اسی طرح اگر ہم مسجد کے طرزِ تعمیر پر غور کریں تو ہمیں اس کی دو نمایاں خصوصیات نظر آتی ہیں۔ گنبد اور مینار۔ ان دونوں کا تصور بھی عرب کی جغرافیائی نوعیت کی دین ہے۔ ریگستان میں دور دور تک پھیلے ہوئے ریت کے ٹیلے گنبد کا نظارہ ہی پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ریگستان میں کھجور کے لمبے اونچے درخت ہی، دور کسی بستی کے ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ دور ہی سے یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں جگہ پر مسجد ہے، اس کے لیے کھجور کے درختوں کے مصداق لمبے اونچے میناروں کا تصور مسجد کے طرزِ تعمیر کی بنیاد بنا۔

ریگستان کے باشندوں کے دل میں سورج کے لیے جذبہ محبت یا جذبۂ عقیدت کا فقدان بھی ایک قدرتی عمل ہے۔ ریگزاروں میں رہنے والے لوگ تو سورج سے پریشان اور ہراساں ہوتے ہیں کیوں کہ سورج کی گرمی سے ریت تپتی جھلستی ہے جس کے باعث ان کی نقل و حرکت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ ایسے معاشرے میں چاند کے لیے مخصوص محبت کا پایا جانا بھی قدرتی ہے کیوں کہ چاند کی کرنیں ریت کو ٹھنڈک دے کر، دن بھر دھوپ کی تمازت سے پریشان رہے لوگوں کو راحت پہنچاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی کیلنڈر چاند کے ساتھ ساتھ چلتا ہے چاند دکھائی دینے پر روزے شروع ہوتے ہیں، چاند دکھائی دینے پر ہی عید ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں چوں کہ سورج کے خلاف اس قسم کی کسی شکایت کی گنجائش نہ تھی بلکہ یہاں تو فصلوں کے پکنے کے لیے سورج کی گرمی درکار تھی، اس لیے ہندوستانی کیلنڈر سورج کے حساب سے بنا۔ ان دونوں کیلنڈروں کے قمری اور شمسی ہونے کے اسباب خالص جغرافیائی اسباب ہیں۔ ہندوستان میں خورشید، اپنی اہمیت اور افادیت کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کے نزدیک قابلِ تعظیم ہوا اور ہندوستانی معاشرے نے اسے ''سورج دیوتا'' کہہ کر اس کی پوجا شروع کر دی۔

غرض یہ کہ انسان کی ذاتی اور اجتماعی ضروریات کو پورا کرنے کے مقصد کے پیشِ نظر جو طور طریقے کبھی وضع کیے گئے تھے، وہ اپنی نفسیاتی اور اقتصادی اہمیت کی وجہ سے، جغرافیائی تقاضوں کے مطابق روایات کی صورت اختیار کرتے گئے اور رسم و رواج بن گئے۔ تمدنی ارتقا کے ساتھ ساتھ ان رسومات کو مذہبی کتابوں میں جگہ ملتی گئی اور ان کی ادائیگی کو تقدیس کی پاسداری سمجھا جانے لگا۔ حالاں کہ یہ رسم و رواج تغیراتِ زمانہ سے متاثر ہوتے رہے ہیں اور معاشرے کی بدلتی ہوئی سوچ ان پر اثر انداز ہوتی رہی ہے لیکن چوں کہ ان کی ضرورت کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ بنی رہی ہے اس لیے ان کا چلن تا حال جاری ہے۔ بعض رسم و رواج

اس لیے دم توڑ گئے ہیں چوں کہ ان کی سماجی اہمیت کم ہوگئی تھی اور معاشرے کو ان کی ضرورت کا احساس نہیں رہا تھا۔

مختصر یہ کہ زندگی کے مختلف مراحل میں پیش آنے والی ضرورتوں کو پورا کرنے کی فطری غرض سے ابتدائی معاشرے نے جن اعمال کو مناسب سمجھا تھا اور اس مقصد کے لیے جو طور طریقے وضع کیے تھے، ان کی اہمیت جیسے جیسے مسلّم ہوتی گئی ویسے ویسے وہ طریقے عام ہوتے گئے۔ یہی طریقے رفتہ رفتہ پورے معاشرے کا چلن بن گئے اور روایتوں کی صورت اختیار کر کے رسم و رواج کے نام سے جانے جانے لگے۔ یہ رسم و رواج ہمارا بیش قیمت ثقافتی ورثہ بھی ہیں اور ہماری شناخت بھی ان کے ذریعے ہی ممکن ہوتی ہے۔

~~~~~
~~~~~

باب-۲

رسوماتِ طفلی

آریوں کے قدیم معاشرے میں عہدِ طفلی سے متعلق رسومات بچّے کی پیدائش سے کہیں پہلے ہی شروع ہو جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ تو وہ بھی تھا جب رسم و رواج کے سایے ہی میں عورت حمل اختیار کیا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ بچّے کی پیدائش سے پہلے کی رسوم بند ہوتی چلی گئیں اوران کی حیثیت تاریخِ معاشرہ کے مطالعے میں کام آنے والے اشارات کی ہوگئی۔ موجودہ معاشرے میں مرّوج رسم و رواج کا سلسلہ بچّے کی پیدائش کے بعد ہی سے شروع ہوتا ہے۔ ان میں سب سے پہلی رسم رسمِ تسمیہ ہے۔

رسمِ تسمیہ

جب سے انسانی معاشرہ وجود میں آیا ہے، پیدا ہونے والے ہر بچّے کو کسی نہ کسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ تسمیہ کی یہ رسم سماجی ضرورت کے باعث پیدا ہوئی تھی جسے شناخت کی ضرورت کہا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں اسے ''نام کرن سنسکار'' کہا جاتا ہے۔ دستیاب تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسمِ تسمیہ ویدوں کے زمانے میں شروع ہوگئی تھی۔ ''رگ وید'' میں ''نامن'' کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بعد ''براہمن گرنتھوں'' اور ''سمرتیوں'' میں بھی ''نام کرن'' کا ذکر ملتا ہے۔ ''گریہہ سوتروں'' میں اس رسم کی تفاصیل موجود ہیں کہ بچّے کا نام کس طرح کا ہونا چاہیے، اس کے نام کا آخری حرف کیا ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ ''گریہہ سوتروں'' نے اس رسم کے انعقاد کے لیے بچّے کی پیدائش کے دسویں یا بارھویں دن کا تعیّن کیا ہے۔

عہد قدیم میں اس رسم کو اس طرح ادا کیا جاتا تھا کہ عورت کے غسل زچگی کے بعد پہلے گھر کو پانی سے دھو کر صاف کیا جاتا تھا۔ غسل کے بعد ماں، بچّے کو اس کے والد کے حوالے کر دیتی تھی۔ والد بچّے کو براہمنوں کے حضور لے جاتا تھا۔ اس موقع پر اس کے تمام عزیز و اقارب موجود ہوتے تھے۔ بچّے کے دائیں کان میں والد کہتا تھا۔ ''اے بچّے! تو کُل دیوتا کی مہر کے صدقے پیدا ہوتا ہے۔ تیرا نام فلاں ہے۔'' اس تسمیہ کے بعد وہاں پر موجود لوگ اور براہمن بچّے کو دعائیں دیتے تھے۔ اس موقع پر برادری اور براہمنوں کے طعام کا انتظام کیا جاتا تھا۔

ازاں بعد اس رسم کا روپ بدل گیا۔ بچّے کا نام ماں باپ، رشتہ داروں اور دوست احباب کے مشورے سے رکھا جانے لگا۔ اس طریقۂ تسمیہ میں تین باتیں ملحوظِ نظر رہتی تھیں۔ بچّے کا نام:

(۱) کُل دیوتا یا سیارے کے نام پر رکھا جاتا تھا۔

(۲) خدا کے نام کی نسبت سے طے کیا جاتا تھا۔

(۳) بچّے کے مستقبل سے متعلق والدین کی خواہش کے مطابق رکھا جاتا تھا۔

پہلی صورت میں کُل دیوتا شِو ہونے پر بچّے کا نام شِو ناتھ، شِو دیو، شِو کمار، شِو سنگھ وغیرہ رکھ دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس سیارے کی نسبت سے بھی بچّے کا نام رکھ دیا جاتا تھا جس کے تحت اس کا جنم ہوتا تھا۔ ایسے ناموں میں بدھ رام، گورو دیو، منگل سنگھ، سوم کمار، شکر سنگھ جیسے نام اس کی مثال کے طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ دوسری صورت میں، بچّے کا نام رکھتے وقت والدین کے ذہن میں یہ خیال ہوتا تھا کہ جتنی بار بھی بچّے کا نام ان کی زبان سے نکلے گا، اتنی بار ہی وہ خدا کا نام لیں گے۔ اس لیے بچّے کے نام میں رام، کرشن، دُرگا، ایشور وغیرہ الفاظ کو شامل کر لیا جاتا تھا۔ نام کے ساتھ محمدؐ یا احمد لگانے میں بھی رسولؐ کو یاد کرتے رہنے کی خواہش مضمر ہے۔ تیسری قسم کے نام اس امید کے مظہر ہوتے تھے، جو والدین نے بچّے کے مستقبل کے ساتھ وابستہ کی ہوتی تھی۔ آنے والے وقتوں میں والدین اپنے بچّے کو جو کچھ بنانا چاہتے تھے، ویسا ہی اس کا نام رکھ دیا کرتے تھے۔ دھن راج، حاکم سنگھ، سروجیت، من دیپ، زور آور سنگھ وغیرہ اسی قسم کے نام ہیں۔

تسمیہ کے اس طریقے پر بعض دیگر اسباب بھی اثر انداز ہوتے رہے۔ ویدوں کے عہد کی رسم جب زوال پذیر ہوئی تو عام طور پر بچّے کا نام بغیر کسی رسم یا تقریب ہی کے رکھا جانے لگا اس طرح رکھے جانے والے ناموں میں اکثر نام، معنویت کے اعتبار سے ناقص ہوتے تھے اور

بعض اوقات بے معنی یا متضاد معانی کے حامل بھی ہو جاتے تھے۔ بے معنی ناموں میں مثال کے طور پر پولو رام، گھولو رام، گھسیٹا رام، کالو رام جیسے ناموں کو لیا جاسکتا ہے۔ متضاد معانی کے حامل ناموں میں پرکاش سنگھ، گورا لال، ہیرا چند، سورج چند، کومل سنگھ، پوتر سنگھ جیسے نام اسی زمرے میں آتے ہیں۔

کسی معاشرے کے سیاسی حالات بھی بچّے کے نام کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں شخصی حکومتوں کے دور میں صاحب سنگھ، مصاحب چند، حاکم رائے، حکومت رائے جیسے نام والدین کی اس آرزو کے مظہر ہوتے تھے کہ ان کا بچّہ بڑا ہو کر اہلکار بنے گا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے دوران جرنیل سنگھ، کرنیل سنگھ، فوجا سنگھ، میجر سنگھ، کپتان سنگھ جیسے فوجی ناموں کا رواج ہو گیا تھا۔ انگریزی حکومت کے دوران صوبہ سنگھ، ضلع سنگھ، انگریز لال جیسے نام مرّوج ہوئے۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے رہنماؤں نے بھی بچّے کے 'نام کرن' کو متاثر کیا۔ جے ہند، بھارت بھوشن، جواہر لعل، سبھاش چندر، گوپال کرشن جیسے ناموں کا رواج ہماری آزادیٔ وطن کے لیے جدوجہد ہی کا ثمرہ ہے۔

نام رکھنے کی ویدک رسم جب دوبارہ ہمارے معاشرے میں نمودار ہوئی تو اس کی صورت ہی تبدیل ہوگئی۔ سکھ گھروں میں ''گورو گرنتھ صاحب'' سے ''واک'' لے کر، مصرعے کے پہلے حرف پر بچّے کا نام رکھا جانے لگا۔ اس رسم کی نقل میں ہندو گھروں میں ''رامائن'' سے چوپائی لے کر، اس کے پہلے حرف سے نام رکھنے کی رسم شروع ہوگئی۔

دورِ حاضر میں رسمِ تسمیہ مختلف علاقوں میں مختلف خاندانی روایتوں کے مطابق ادا کی جاتی ہے۔ متعدد علاقوں میں تو یہ رسم ناپید ہی ہو چکی ہے۔ جہاں جہاں اس کا چلن باقی بھی ہے وہاں بھی لوگوں نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق اس کو اپنی مرضی کی شکل دے دی ہے۔ موجودہ وقتوں میں یہ رسم اس طرح انجام پاتی ہے کہ کہیں 'واک' لے کر، کہیں یگیہ کے بعد گیتا کے کسی اشلوک سے یا کسی سیارے کی نسبت سے، کہیں کسی خاص رشتہ دار یا براہمن کے تجویز کیے ہوئے حرف پر اور کہیں ہَون کے بعد جنم لگن کی بنا پر یا راشیوں کے طے شدہ حروف کے مطابق بچّے کا نام رکھا جاتا ہے۔

رسمِ موتراشی

جب سے ابتدائی انسان کی سوچ نے اسے اس کے بڑھتے ہوئے بالوں اور ناخنوں کے بارے میں باخبر کیا ہے، تبھی سے سر کے بالوں اور ہاتھوں پیروں کے ناخنوں کا کاٹنا جاری ہے۔ مہذب سماج نے سر کے بال کاٹنے کے لیے پتھر اور لوہے کے اوزار ایجاد کیے۔ ویدوں میں دستیاب حوالوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ رسمِ موتراشی تہذیب یافتہ معاشرے کی ایک قدیم رسم ہے، جسے ''مُنڈن سنسکار'' کہا جاتا تھا۔

مہذب ہورہے انسان نے سر کے بالوں کو اس لیے کاٹنا شروع کیا تھا چوں کہ صفائی کے طریقوں کی عدم موجودگی میں بڑھتے ہوئے بالوں میں جوئیں پڑجاتی تھیں اور سر کی متعدد تکلیفیں شروع ہوجاتی تھیں۔ بڑھتے ہوئے بالوں کو تراشنے سے اس کے حسن میں جو اضافہ ہوا اور اس کے نقش و نگار پر جو نکھار آیا، اس نے بھی اس رسم کے اجرا میں معاونت کی۔ حمل کے بالوں سے منسلک غلاظت اور آبستنی جراثیم کے احساس نے بھی اس رسم کے رواج پانے میں مدد دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں اور گریہہ سوتروں میں سر کے بال تراشنے سے طویل عمر، خوب صورتی، عقل اور ادراک کا حاصل ہونا بتایا گیا ہے۔

قدیم سماج میں اس رسم کے منانے کا طریقہ یہ تھا کہ بچّے کی عمر کے پہلے، تیسرے، پانچویں یا ساتویں سال میں، چیت یا پوس کے مہینے میں، بچّے کا باپ ''گنیش پُوجن'' کرکے براہمنوں کو کھانا کھلاتا تھا۔ اس کے بعد بچّے کو نہلا دھلا کر، اسے کورے کپڑے سے ڈھانپ کر، بچّے کی والدہ اسے گود میں لے کر یگیہ کی آگ کے مغرب میں بیٹھ جاتی تھی۔ والد ایک ہاتھ بچّے کے جسم پر رکھ کر، دوسرے ہاتھ سے یگیہ میں آہوتیاں ڈالتا تھا۔ یگیہ کے بعد وہ گھاس (کُشا) کی تین گُچھیاں لے کر بچّے کے بالوں میں ٹانک دیتا تھا اور دعا کرتا تھا کہ جس استرے سے بچّے کا سر مونڈا جائے گا، وہ استرا بچّے پر مہربان ہو اور موتراشی سے بچّے کی عمر اور صحت میں اضافہ ہو۔ اُس زمانے میں اس رسم کو ''چوڑاکرن'' اور ''چول کرم'' کے ناموں سے بھی جانا جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ اس رسم کی صورت بدلنے لگی۔ براہمنوں کی ضیافت کے ساتھ ساتھ برادری بھاری چارے کا طعام اور لڈّو اور گُڑ بانٹنا بھی اس میں شامل ہوگیا۔ پھر ایک زمانے میں موتراشی (مُنڈن) اور طعام (بھوج) دو مختلف رسمیں ہوگئیں۔ ان دونوں رسموں کو الگ الگ وقت پر ادا کیا جانے لگا۔ دیوی دیوتاؤں سے نسبت دے کر مختلف خاندانوں نے کسی مخصوص دیوی یا دیوتا

کے مندر میں جاکر بال اُتروانا شروع کر دیا، اور موتر اشی کی رسم ایک روایتی تقریب کی صورت اختیار کرگئی۔ پرانے زمانے میں تو بچّے کے سر سے اترے ہوئے بالوں کو، گھاس کی گچھیوں سمیت، گوبر میں دبا کر گئوشالہ میں گاڑ دیا جاتا تھا لیکن جب گھر سے چل کر یہ رسم مندر جا پہنچی تو بالوں کو مندر کے طوف میں چھوڑنے کا رواج ہوگیا۔

دورِ حاضر میں اس رسم کی مرّوجہ صورت یہ ہے کہ رسمِ موتراشی سے قبل، بالعموم جنم اشٹمی کے دن، بھوج کی رسم ادا کی جاتی ہے، جسے ''بھوج بھرنا'' کہا جاتا ہے۔ رسمِ مُوتراشی میں برادری بھائی چارے کی موجودگی میں، گھر کا نائی بچّے کے بالوں کی دو ایک لٹیں کاٹ کر اس کی والدہ کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ ان لٹوں کو تب تک سنبھال کر رکھا جاتا ہے جب تک باقی کے بال کسی دیوی دیوتا کے مندر میں نہیں اُتارے جاتے۔ پھر چیت یا آشوِن مہینے کی دُرگا اشٹمی کے دن یا اس سے ایک روز قبل، کُل دیوی یا دیوتا کے مندر میں جاکر بال اُتارے جاتے ہیں۔ گھر پر کاٹی گئی لٹیں ان بالوں میں شامل کر کے، بالوں کو مندر کے طوف میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

مُوتراشی کی قدیم رسم کے جو نشانات موجودہ رسم میں پائے جاتے ہیں، ان کے طفیل یہ ہوتا ہے کہ کوئی براہمن، منتروں کی تلاوت کے ساتھ، بچّے کے سر پر پانی کے چھینٹے دیتا ہے اور نائی اس وقت بچّے کی لٹیں کاٹتا ہے جس وقت بچّہ اپنے باپ کی گود میں بیٹھا ہوتا ہے۔ کاٹی ہوئی لٹوں کو وہ اس کی ماں کے دامن میں ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد، باجے گاجے کے ساتھ، بچّے کو خاندانی درخت (کُل ہرِکش) کی پوجا کے لیے لے جایا جاتا ہے۔ مندر جاکر بال اُتارنے کی رسم قریبی رشتہ داروں تک محدود رہتی ہے۔

رسمِ گوش نقبی

اگرچہ ہندوستان کے تمام علاقوں میں مردوں اور عورتوں کے کان چھیدنے کا رواج عام رہا ہے لیکن ویدوں اور شاستروں میں اس سے متعلق کسی رسم کا ذکر دستیاب نہیں ہے۔ بعد کے سُوتروں میں نہ صرف اس کا ذکر ہی ملتا ہے بلکہ اس رسم کے انعقاد سے متعلق تفاصیل بھی ملتی ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گوش نقبی کی رسم ویدوں کے عہد کی رسم نہیں ہے بلکہ بعد کی رسم ہے۔

میرے خیال میں یہ رسم اس زمانے میں شروع ہوئی ہوگی، جس زمانے میں ہمارا معاشرہ نصف مہذب معاشرہ رہا ہوگا۔ اُس زمانے میں سونے چاندی کی حفاظت کا سب سے اعلیٰ طریقہ یہی تھا کہ اسے اپنے جسم پر پہن لیا جائے۔ جب ہمارا معاشرہ مکمل طور پر تہذیب یافتہ ہوگیا تو سونے چاندی کی حفاظت کی رو سے تو یہ رسم ایسی اہم نہیں رہی لیکن ''آیوروید'' نے متعدد بیماریوں مثلاً فوطے کا بڑھنا، کسی آنت کا بڑھنا، انتڑیوں کی سوزش، دمہ وغیرہ کے علاج کے لیے گوش نقھی کو ضروری قرار دے دیا۔ ظاہر ہے کہ انسانی ضرورت کے پیش نظر پیدا ہوئی یہ رسم، متعدد امراض کی پیش بندی کے طور پر مذہبی اور ثقافتی اہمیت کی حامل بن گئی۔

عہد قدیم میں اس رسم کو'' کرن ویدھ سنسکار '' کہا جاتا تھا۔ شروع شروع میں تو یہ رسم بچّے کی پیدائش کے دسویں، بارھویں یا سولھویں دن ہی ادا کر دی جاتی تھی لیکن آگے چل کر بچّے کی گوش نقھی چھٹے، ساتویں، آٹھویں یا بارھویں مہینے میں ہونے لگی۔ پھر اس رسم کے لیے دنوں یا مہینوں کی قید اُٹھادی گئی۔ والدین جب مناسب سمجھتے تھے بچّے کی گوش نقھی کرا دیتے تھے۔ پرانے زمانے میں اس رسم کو تقریب کے طور پر منایا جاتا تھا۔ رسمِ گوش نقھی کے دن بچّے کو نہلا دھلا کر، اس کے کانوں پر سرخی مل دی جاتی تھی۔ اسے مشرق رو بٹھا کر مٹھائی کھلائی جاتی تھی اور پھر منتروں کی تلاوت کے ساتھ اس کے کان چھیدے جاتے تھے۔ دائیں کان کو پہلے چھیدا جاتا تھا، بائیں کان کو بعد میں۔ لڑکیوں کی گوش نقھی میں پہلے بائیں کان کو چھیدا جاتا تھا اور پھر دائیں کان کو۔ کان چھیدنے کے لیے مختلف ذاتوں کے لیے مختلف قسم کی سوئیاں مستعمل تھیں۔ مذہبی اعتقاد کے زمانے میں صرف تانبے کی سوزن ہی گوش نقھی کے کے لیے مستعمل تھی لیکن جب ذاتوں کا نظام رائج ہوگیا تب کشتری کے کان سونے کی سوئی سے، براہمن اور ویش کے کان چاندی کی سوئی سے اور شودر کے کان لوہے کی سوئی سے چھیدنے جانے لگے۔ کان چھیدنے کے بعد براہمنوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا اور برادری بھائی چارے میں مٹھائی تقسیم کی جاتی تھی۔

دورِ حاضر میں، جہاں تک مردوں کی گوش نقھی کا سوال ہے، یہ رسم، بعض قبیلوں کے استثنیٰ کے ساتھ، عام طور پر رمیدہ ہے۔ ہندوستانی سماج میں لڑکیوں کے کان چھیدنے کا رواج البتہ موجود ہے مگر اس کے پس منظر میں نہ تو سونے چاندی کی حفاظت کا جذبہ ہی کار فرما ہے اور نہ آیوروید کی ہدایات ہی سے عوام باخبر ہیں۔ لڑکیوں کے کان صرف اس لیے چھدائے جاتے ہیں تا کہ وہ کانوں میں زیور پہن سکیں۔ جہاں تک اس سے متعلق رسم کا تعلق ہے، موجودہ سماج میں لڑکیوں کے کان چھیدنے پر بھی یہ رسم روپوش ہو چکی ہے۔ آج کل نہ تو اس بات کا خیال

رکھا جاتا ہے کہ سوئی کس قسم کی ہو اور نہ اس کے لیے کسی دن وار کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ پرانے زمانے کی طرح آج بھی اکثر لڑکیوں کی گوش نقی زرگر ہی کرتے ہیں لیکن اب انہیں ادائیگی رسم کے لیے باقاعدہ مدعو نہیں کیا جاتا۔ عام طور پر گھر کی بڑی بوڑھیاں خود ہی لڑکیوں کے کان چھید دیتی ہیں۔

رسمِ بسم اللہ خوانی

تعلیم کی ابتدا سے متعلق یہ رسم جسے ''وِدیا آرمبھ سنسکار'' کہا جاتا تھا، ایسی بدقسمت رسم ہے کہ ابتدائی سماج میں تو تعلیم ہی ناپید تھی لہٰذا اس رسم کے رائج ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب سماج کی تنظیم ہوئی اور حروف کا وجود عمل میں آیا، تب یہ رسم ان امیر گھروں میں قید ہوگئی جن کے بچوں کے لیے تعلیم کا انتظام ممکن تھا اور جب تعلیم کا رواج عام ہوا اور لکھنے پڑھنے کی سعادت ہر کسی کو نصیب ہونے لگی تو اس رسم کی حالت یہ ہوئی کہ اس کا چلن ہی برائے نام رہ گیا۔

عہدِ قدیم میں بچہ جب پانچ برس کا ہو جاتا تھا تو پنڈت علمِ نجوم کی مدد سے اس رسم کی ادائیگی کا دن مقرر کرتا تھا۔ رسم کے دن بچے کو نہلا دھلا کر، اسے خوب صورت کپڑے پہنائے جاتے تھے اور عطر لگائے جاتے تھے۔ تب اس سے ''گنیش، سرسوتی، برہسپتی اور کل دیوتا'' کا پُوجن کرایا جاتا تھا۔ پوجا کے بعد ہَون ہوتا تھا۔ ہَون کے وقت استاد مشرق رو ہو کر بیٹھتا تھا اور شاگرد مغرب رو ہو کر۔ ہَون کے بعد استاد چاندی کی تختی پر زعفران بچھا کر، اس پر سونے کے قلم سے ''شری گنیش آئے نمے، سرسوتیے نمے، گریہہ دیوتا بھیونمے، لکشمی نارائینا بھیام نمے، اوم نمے سِدّھائے'' لکھ دیتا تھا۔ تب استاد (آچاریہ) اسے دھیرے دھیرے تین بار پڑھتا تھا اور شاگرد اس کے پیچھے پیچھے بولتا تھا۔ اس کے بعد بچے کے ہاتھ سے استاد کو کپڑا، زیور اور پگڑی دلوائی جاتی تھی اور سہاگ اولاد والی عورتیں بچے کی آرتی اُتارتی تھیں۔

ہندوؤں کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں میں بھی یہ رسم ذرا مختلف طریقے سے رائج رہی۔ مسلمانوں کے ہاں اسے اس طرح ادا کیا جاتا تھا کہ بچہ جب پانچ سال چار مہینے چار دن کا ہوتا تھا تو مولوی کو بلا کر اسی طرح بچے کو نہلا دھلا کر پڑھنا شروع کرایا جاتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس موقع پر مسلمانوں کے یہاں ہَون، منتروں کی تلاوت یا آرتی اتارنا نہیں ہوتا تھا۔ مولوی بچے کو 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' پڑھواتا تھا اور بعض علاقوں میں 'بسم اللہ' کے ساتھ 'کلمہ شریف' بھی

پڑھا دیا جاتا تھا۔ ہندوؤں کے گورو کی طرح ہی مولوی کو بھی بچّے کے ہاتھ سے کپڑا، زیور اور دستار دلوائی جاتی تھی۔ مغل بادشاہ بابر نے ہمایوں کے پڑھنا شروع کرنے پر اس رسم کو بڑی دھوم دھام کے ساتھ منایا تھا۔

عہدِ حاضر میں، بطور رسم کے، اس کا چلن ختم ہو چکا ہے۔ کچھ علاقوں میں اس کی صورت یہ ہوگئی ہے کہ اسکول میں داخل ہونے کے بعد، بچّہ جب پہلی بار کتاب کاپی اُٹھاتا ہے تو اس کے ماتھے پر تلک لگا کر، اس کے ہاتھ میں چاول دے دیے جاتے ہیں۔ گھر کا کوئی پڑھا لکھا بزرگ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے ''اوم'' لکھوا دیتا ہے۔ کریش میں پلنے والے اور کانوینٹ میں پڑھنے والے عہدِ جدید کے بچّوں کے لیے تو یہ رسم بے معنی ہوگئی ہے لیکن جب اس رسم کا اجرا ہوا تھا تب تعلیم کسی خوش نصیب بچّے کا ہی مقدر ہوتی تھی۔

پانچ سال کی عمر میں، اس طرح رسمی طور پر تعلیم شروع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ بچّے کا ذہن اس احساس سے ہمکنار ہو کر جب پڑھائی شروع کرنے پر ہی وہ اس قدر اہم ہوگیا ہے کہ اس کی شان میں ایسی تقریب کا انعقاد ہو رہا ہے، تو اس وقت سماج میں اس کی اہمیت کتنی بڑھ جائے گی جب وہ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو جائے گا۔

رسمِ زُنّار

مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اگرچہ موجودہ ہندوستانی معاشرہ بہت سی رسموں کو خیر باد کہہ چکا ہے اور ان رسموں میں رسمِ زنّار بھی شامل ہے لیکن جہاں کہیں بھی اور جس کسی صورت میں بھی یہ رسم باقی ہے، وہاں اس رسم کو دیگر تمام رسومات پر فوقیت حاصل ہے۔ اگلے وقتوں میں تو اس رسم کے ساتھ بچّے کا دوسرا جنم شروع ہوتا تھا۔ بغیر اس رسم کے اس کا سماج میں داخلہ ممنوع تھا۔ ہندو معاشرے میں اس رسم کو وہی درجہ حاصل تھا جو عیسائی معاشرے میں بپتسمہ کو، مسلم معاشرے میں ختنہ کو اور پارسی معاشرے میں نوجات کو حاصل ہے۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اس رسم کو ''اُپ نئین''، ''یگیو پَویت''، ''جنیو'' وغیرہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ویدوں کے زمانے میں اس رسم کو اس وقت ادا کیا جاتا تھا جب بچّہ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کسی گورو کے پاس جاتا تھا اور گورو رسمِ زنّار کے ذریعے اسے اپنے

حلقۂ تلمذ میں شامل کرتا تھا۔ بعد میں اس رسم کو مذہبی رنگت دے کر تقریب کی صورت عطا کردی گئی لیکن اس کا بنیادی مقصد وہی رہا پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور ذاتوں کا نظام زور پکڑتا گیا، ویسے ویسے یہ رسم اپنا روپ بدلتی رہی۔ بالآخر اس رسم کا مقصد ابتدائے تعلیم کے بجائے بچّے کا سماج میں داخل ہونا ہوگیا۔ گریہہ سوتروں کے مطابق براہمن کی رسم زنار آٹھویں سال میں، کشتری کی گیارھویں سال میں اور ویش کی بارھویں سال میں ہوتی تھی۔ اُس زمانے میں رسمِ زنار ایک بڑی رسم کا حصہ ہوا کرتی تھی، جسے ''اُپ نین'' کہا جاتا تھا۔

عہد قدیم میں یہ رسم اس طرح ادا کی جاتی تھی کہ جس روز بچّے کا ''اُپ نین'' ہونا ہوتا تھا، اس سے ایک رات قبل بچّے کے جسم پر ہلدی کا لیپ کردیا جاتا تھا اور اس کی چوٹی کے ساتھ چاندی کی انگوٹھی باندھ دی جاتی تھی۔ اس رات اسے بالکل خاموش رہنا ہوتا تھا۔ اگلی صبح وہ آخری بار اپنی ماں کے قریب بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا۔ یہ بات اس حقیقت کی مظہر ہوتی تھی کہ اب وہ بچہ نہیں رہا اور اس کی انفرادیت اب مسلّم ہوگئی ہے۔ تب وہ گھر والوں کے تیار کیے ہوئے منڈپ میں آتا تھا جہاں اسے نہلایا جاتا تھا۔ نہاکر وہ لنگوٹی پہن لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ معلّم (آچاریہ) کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا جو اس کی زُنار پوشی کر کے اسے اپنے شاگرد کے طور پر قبول کرتا تھا۔ مذہبی کتابوں نے سخت نظامِ ذات کے پیشِ نظر، مختلف ذاتوں کے لیے مختلف قسم کے جنیؤ طے کیے ہوئے تھے۔ براہمن کپاس کا جنیؤ پہنتا تھا، کشتری سن کا اور ویش بھیڑ کی اُون کا۔ اسی طرح براہمن کے جنیؤ کا رنگ سفید ہوتا تھا، کشتری کے جنیؤ کا سرخ اور ویش کے جنیئو کا زرد۔

زنار پوشی کی یہ رسم ایک علامتی رسم ہے۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہوا نوجوان، اس علامت کے ذریعے، معاشرہ، ذات اور مذہب کے تئیں اپنے فرائض سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور اپنے خاندانی وقار کو بنائے رکھنے کا قصد کرتا ہے۔ جنیؤ کی لمبائی بھی ''جاگرتی'' (بیداری)، ''سوپن'' (خوابیدگی)، ''سشپتی'' (بے خبری) اور تُریا'' (علمِ کامل) نامی چار نفسیاتی حالتوں کی علامت ہوتی ہے۔ تین دھاگوں میں لگائی گئی گانٹھ ''برہم گرنتھی'' (نسبتِ الٰہی) کی علامت ہوتی ہے۔ اس سے نوجوان رشیوں، والدین اور خاندان کے دیگر بزرگوں اور دیوتاؤں کے تئیں عقیدت مند بنتا ہے۔ اس کے علاوہ خاندانی روایات کی علامتوں کے طور پر بعض دیگر گانٹھیں بھی جنیؤ میں لگائی جاتی ہیں۔

جن خاندانوں میں رسمِ زنار ابھی تک مروج ہے، وہاں زنار کو عظمت اور توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی پاکیزگی کے بارے میں لوگ اس قدر محتاط رہتے ہیں کہ رفع حاجت کے وقت اسے بائیں کاندھے سے ہٹا کر کان پر رکھ لیتے ہیں۔ کوئی بھی ناپاک کام کرتے وقت زنار کو دائیں کندھے پر رکھا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے ایک جنیؤ پہنا جاتا ہے لیکن شادی کے بعد دو جنیؤ پہنے جاتے ہیں، ایک اپنا اور ایک اپنی اہلیہ کا۔ ہندوستان کے جن علاقوں میں یہ رسم مفقود ہو چکی ہے، وہاں کے لوگ ایک بہت بڑے تہذیبی ورثے سے محروم ہو گئے ہیں۔ درحقیقت رسمِ زنار ایک ایسا شناختی کارڈ تھی جسے لے کر کوئی نوجوان دھرم شاستروں (علومِ دینیات) کے دارالعلوم میں داخل ہوتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں ہمارے نوجوان علم کی اس شاخ سے بے بہرہ ہو گئے ہیں، جس پر کبھی ہندوستان کو ناز ہوا کرتا تھا۔ اب جہاں کہیں یہ رسم موجود بھی ہے، وہاں بھی اس کی ادائیگی ایک روایتی تقریب کے طور پر ہی ہوتی ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ سائنس کے ترقی یافتہ دور میں بالعموم لوگ اپنی قدیم رسومات کو ترک کر دیا کرتے ہیں، اس لیے کہ ان کا ذہن ان رسومات کے پس منظر سے ناواقف اور ان کی افادیت کو سمجھنے سے معذور ہوتا ہے۔

عوامی رسومات

زمانۂ قدیم ہی سے ہندوستانی معاشرے میں تقریبات اور تہواروں کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ عورت کے حاملہ ہونے سے لے کر اس کے بچہ پیدا کرنے تک اور بچے کی پیدائش سے لے کر اس کی شادی تک طرح طرح کی تقریبات کا انعقاد کر کے جہاں ایک طرف ہندوستانی معاشرہ اپنے ذوقِ تقریب سازی کا پتہ دیتا ہے وہاں دوسری طرف اس سے معاشرے کی فارغ البالی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ایسے تو عہدِ طفلی سے متعلق ویدک رسوم ہی تعداد میں کچھ کم نہ تھیں لیکن تقریب پسند ہندوستانی معاشرے نے ان ویدک رسوم کے ساتھ ساتھ متعدد عوامی رسومات بھی جاری کر لیں، جو آج تک کسی نہ کسی صورت میں چلتی آ رہی ہیں۔ ذیل میں ہم ایسی رسومات ہی کا ذکر کریں گے۔

رسمِ آغوش

عورت کے پیٹ میں تشکیل پا رہے بچّے کی ذہنی اور جسمانی ساخت کا عورت کی نفسیات کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہوتا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ حاملہ عورت کو شادکام رکھا جائے۔ ہندوستانی معاشرے میں چوں کہ بیٹا پیدا کرنے کو اعلیٰ اور بیٹی پیدا کرنے کو ادنیٰ سمجھا جاتا رہا ہے، اس لیے حمل کے دنوں میں یہ فکر عورت کے دامنگیر رہتی ہے کہ اس کے پیٹ میں پل رہا بچّہ کہیں لڑکی نہ ہو۔ عورت کو اس ذہنی کشمکش سے نجات دلانے کے لیے اور اسے یہ یقین دلانے کے لیے کہ اس کے پیٹ کا بچّہ لڑکا ہی ہے، گود بھرنے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

اس رسم کی عوامی صورت یہ ہے کہ حاملہ عورت غسل کر کے خوب صورت پوشاک پہنتی ہے۔ گھر اور آس پڑوس کی عورتیں اسے گھیر کر بیٹھ جاتی ہیں۔ گھر کا کوئی خوب صورت کم عمر لڑکا لاکر اس کی گود میں بٹھا دیا جاتا ہے اور حاملہ کو شگون وغیرہ دے کر اس کی عزت افزائی کی جاتی ہے۔ اس رسم کا ایک اور مقصد بھی ہے۔ وہ یہ کہ پہلی بار بچّہ پیدا کر رہی عورت کو، اس کے ذریعے، یہ سمجھایا جاتا ہے کہ وہ حمل کی تمام تر تکالیف کو ہنستے ہوئے برداشت کرے چوں کہ اس کا ثمرہ نرینہ اولاد ہے۔ گود میں بٹھایا گیا لڑکا دورانِ حمل کی تکالیف کی خوش انجامی کی مجسم علامت بن جاتا ہے۔

رسمِ شیرخواری

یہ رسم اس وقت ادا کی جاتی ہے جب ماں پہلی بار بچّے کو اپنا دودھ پلاتی ہے۔ روایت یہ ہے کہ بچّے کے اولین پستان مکیدن سے قبل کوئی غیر شادی شدہ لڑکی دودھ ملے پانی کی کٹوری لے کر، گھاس کی پتّیوں سے، زچہ کے پستانوں کو دھوتی ہے اور باری باری سے سرِ پستان دبا کر ان میں سے دودھ کی دھار گراتی ہے۔

اس رسمِ عوامی کے دو مقاصد ہیں۔ اوّل یہ کہ زچہ کے پستانوں میں بنا ہوا دودھ سرِ پستان میں جما ہوا ہوتا ہے، اس لیے بچّے کو پستان مکیدن میں دشواری ہوتی ہے۔ دودھ کا جما ہوا حصّہ نوزائیدہ بچّے کے پیٹ میں نہیں جانا چاہیے چوں کہ یہ زود ہضم نہیں ہوتا۔ دوم یہ کہ اس کے توسل سے گھر کی جوان لڑکیوں کو ذہنی طور پر تخلیق کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ گھاس کے ذریعے

دھوئی ہوئی چھاتیاں پاک ہو جاتی ہیں اور اس طرح کسی قسم کے جراثیم کے بچّے کے پیٹ میں جانے کا اندیشہ نہیں رہتا۔

دکن میں عورت ماں بننے کے بعد یہ لطیف لمس اپنے شوہر کے ہاتھ سے حاصل کرتی ہے۔

رسمِ بندن وار

جس روز کسی گھر میں بچّے کی ولادت ہوتی ہے، اسی روز اس گھر کے دروازے پر بندن وار لگانے کی رسم زمانہ قدیم سے ہندوستان میں مرّوج ہے۔ اس کے دو مقاصد رہے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس سے معاشرے میں بچّے کی پیدائش کا اعلان ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ چوں کہ سادھو سنیاسی اس گھر سے بھکشا نہیں لیتے جہاں ولادت یا مرگ ہوئی ہو، اس لیے یہ بندن وار ہی انھیں اس دروازے پر الکھ جگانے سے منع کر دیتا تھا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کیوں کہ دروازے پر آئے فقیر درویش کو لوٹانا ہندو سماج میں گناہ سمجھا جاتا تھا اور سادھو سُوتک پاتک والے گھر سے بھیک قبول نہیں کر سکتا تھا۔

مختلف علاقوں میں بندن وار بنانے کے مختلف طریقے مستعمل ہیں۔ عام طور پر مَولی کی ڈوری میں آم کے پتّے پرو کر بندن وار بنایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بندن وار گھر کا نائی، جھیور، براہمن یا کل پروہت بنا کر لاتا ہے۔

رسمِ خواجہ پوجا

ہندوستانی معاشرے میں، ایک زمانے تک، لڑکے کی پیدائش کے موقع پر، رسمِ چاہ مروّج رہی ہے، جسے ''نشکرمن'' کہا جاتا تھا۔ اس رسم کو بڑی دھوم دھام کے ساتھ ایک تقریب کے طور پر منانے کا رواج عام ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ نشکرمن کا چلن کم ہوتا گیا اور اس کی جگہ پر ''خواجہ پوجا'' مقبول ہوتی گئی۔ نشکرمن بچّے کی ولادت کے بارھویں دن کیا جاتا تھا، خواجہ پوجا تیرھویں دن پر ہونے لگی۔

اس رسم کے اجرا کے دو اسباب تھے۔ اوّل یہ کہ بیٹا پیدا کرنے کے بعد عورت جب پہلی بار گھر

سے باہر قدم رکھے تو برادری بھائی چارے کی عورتیں اس کا خیر مقدم کر کے اس کی عزت افزائی کریں اور اسے بیٹا پیدا کرنے پر مبارک باد دیں۔ دوسرے یہ کہ اس کے ذریعے ''وزن دیوتا'' (فرشتۂ آب) کی پوجا کی جا سکے۔ اسلامی دورِ حکومت میں چوں کہ 'وزن دیوتا' کا تصور چاہ کے روپ میں کیا گیا اور اسے ''خواجہ خضر'' کا نام دیا گیا، اس لیے کنویں کو خواجہ، خواجہ پیر، خواجہ خضر جیسے ناموں سے معنون کیا گیا۔ انسانی سماج میں ابتدا ہی سے پینے کے پانی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ عرب کے ریگستانوں میں پیدا ہوئے اسلامی معاشرے کے لیے پانی کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی۔ چاہ کے تئیں یہ جذبۂ عقیدت درحقیقت پینے کے پانی کو صاف اور پاک رکھنے کی غرض سے ہی پیدا کیا گیا تھا۔

رسم مذکور میں، بچّے کی ولادت کے تیرھویں روز ماں اور بچّے کو نہلا دھلا کر، خوب صورت کپڑے پہنا کر، گھر کے کسی قریبی چاہ پر لایا جاتا ہے جہاں پر پہلے سے مدعو کی ہوئی عورتیں ان کی منتظر ہوتی ہیں۔ چاہ کی جگت پر بٹھا کر ماں بیٹے کے ہاتھ سے سرخ کپڑا، سُپاری، مولی اور اُبلا ہوا اناج چڑھوا کر وزن دیوتا کی پوجا کی جاتی ہے۔

رسمِ ماہچہ پوشی

بچّہ جب ایک برس کا ہو جاتا ہے تو، دیوالی سے آٹھ روز قبل اسے ماہچہ پہنایا جاتا ہے جسے عرفِ عام میں ''چندک'' یا ''چندوا'' کہتے ہیں۔ مختلف علاقوں میں اسے تنیرا، تندیرا، کنٹھا، کنٹھا کنٹھ چندر وغیرہ کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ رسم یہ ہے کہ بچّہ جب سال بھر کا ہو جاتا ہے تو دیوالی سے آٹھ دن پہلے گھر میں ''ہوئی پوجا'' کی جاتی ہے۔ اس پوجا کے بعد بچّے کو ہوئی کے سامنے بٹھا کر اس کے گلے میں چاندی کا ماہچہ پہنایا جاتا ہے۔ ''ہوئی'' کی پوجا عورتیں اولاد حاصل کرنے کے لیے اور اولاد کو ہر طرح سے محفوظ رکھنے کی دعا مانگنے کے لیے کرتی ہیں۔ ''ہوئی پوجا'' کے بعد بچّے کے گلے میں آدھے چاند کی شکل کا چاندی کا زیور پہنا کر اس کے لیے عمر درازی کی دعا کی جاتی ہے۔

اس رسم کے جاری ہونے کے دو اسباب تھے۔ پہلا تو یہ کہ اس زیور کے توسل سے نصف مہذب معاشرہ میں بچّے کی عمر معلوم کی جاتی تھی۔ پہلے برس جو ماہچہ بچّے کو پہنایا جاتا ہے، ہر سال اس کے اوپر چاندی کی ایک تہہ اس طرح چڑھائی جاتی ہے کہ چڑھی ہوئی چاندی الگ

سے دکھائی دے۔ ماںچہ کے اوپر جتنی بار چاندی کا چڑھاوٗ ہوگا، بچّے کی عمر اتنے برس کی ہی ہوگی۔اس کا ایک قدیم روپ یہ بھی رہا ہے کہ بچّہ پیدا ہونے کے بعد گھر کے کسی کونے میں ایک رسّی ٹانگ دی جاتی تھی اور ہر سال اس رسّی میں ایک گانٹھ لگادی جاتی تھی۔ ان گرہوں کو گن کر بچّے کی عمر معلوم کی جاتی تھی۔ ''سالگرہ'' لفظ یہیں سے بنا ہے۔نصف مہذب معاشرے میں اس رسی کی جگہ ماںچہ نے لے لی۔ دوسرا سبب تھا دولت جمع کرنا۔ چاندی کے ماںچہ پر ہر برس تھوڑی چاندی چڑھاکرایک طرح سے چاندی جمع کی جاتی تھی۔لڑکے کی شادی کے موقع پر اس ماںچہ کو بیچ کر اس کے دام کھرے کر لیے جاتے تھے۔لڑکے کی شادی کے موقع پر ماںچہ تڑوانے کی روایت ابھی تک موجود ہے۔ اکثر لوگ اسی چاندی سے دلہن کے لیے زیور بنواتے ہیں۔شادی کے بعد ماںچہ نہیں پہنا جاتا۔

غیر مروّج رسومات

ضعیف الاعتقادی کے حامل ہندوستانی معاشرے میں مختلف قسم کے رسم و رواج مروّج رہے ہیں۔ کسی زمانے میں ان رسومات کی ضرورت بھی تھی اور افادیت بھی۔ قدیم مذہبی علماء، رشیوں منیوں کی ایجاد کردہ ان رسموں کو یکسر بے معنی قرار دینا تو ان کی ذہانت اور حکمت عملی سے انکار کرنا ہوگا جو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے لیکن زمانے کی گردش کے ساتھ ساتھ ان میں سے بعض رسمیں اپنی اہمیت سے ہاتھ دھوبیٹھی ہیں۔بعض رسمیں تو،تغیرات زمانہ کے باعث اپنی افادیت بھی کھوچکی ہیں اور اہمیت بھی۔ بعض رسمیں ایسی ہیں جو بامعنی و بامقصد ہونے کے باوجود ضعیف الاعتقادی کے باعث ایسی ایسی علامتی صورتیں اختیار کرگئی ہیں کہ عام آدمی کے لیے ان کا مقصد تو درکنار مطلب تک سمجھنا دشوار ہوگیا ہے۔علم و ادب کی روشنی کے باوجود ہمارا موجودہ معاشرہ بعض رسومات کو روایت کے طور پر ادا کیے جارہا ہے اور بعض کو اپنی سماجی حیثیت کے خیال سے بلکہ یہ کہیے کہ سماج میں اپنی ناک رکھنے کے خیال سے ادا کرتا ہے۔جن رسومات کو ادا بھی کیا جاتا ہے، ان کی ادائیگی کے بھی آسان طریقے وضع کر لیے گئے ہیں تاہم بعض رسومات ایسی ہیں جن کا چلن اب ختم ہو چکا ہے۔ بلامضائقہ ایسی رسموں کو غیر مرّوج رسومات قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ موجودہ مرّوج رسومات میں ان متروک رسموں کے عناصر بآسانی دیکھے جاسکتے ہیں لیکن زمانۂ قدیم کی یہ رسمیں آج مفقود ہیں۔ موجودہ رسومات میں بعض ایسی رسمیں بھی ہیں جن کو ان متروک رسموں کی بدلی ہوئی صورت قرار دیا

جاسکتا ہے لیکن رسومات کے طور پر ان کی انفرادی حیثیت ختم ہو چکی ہے اور موجودہ معاشرہ ان سے کنارا کش ہو چکا ہے۔ ذیل میں عہد طفلی سے متعلق غیر مروج رسومات کا ذکر کیا جائے گا۔

رسمِ تحمیل

اس رسم کا اصل نام "گربھادھان سنسکار" ہے۔ عہد قدیم میں جب مرد اولاد پیدا کرنے کے ارادے سے اپنی بیوی سے ہم بستری کرتا تھا تو اس سے قبل اس کے گھر میں رسم تحمیل ادا کی جاتی تھی۔ اس رسم کی ادائیگی میں یگیہ ہوتا تھا۔ ازاں بعد ناندی شرادھ (خیرات برائے بہبود) اور گنیش پوجا کر کے عزیز و اقارب کی دعوت کی جاتی تھی۔ ان سب سے فارغ ہو کر میاں بیوی تنہائی میں چلے جاتے تھے جہاں شوہر، مخصوص منتر بولتے ہوئے مباشرت کرتا تھا۔

رسمِ نرینہ

یہ رسم اس غرض سے ادا کی جاتی تھی کہ حاملہ عورت نرینہ اولاد پیدا کرے۔ اسے "پُنسون" کہا جاتا تھا۔ حمل کے تیسرے یا چوتھے مہینے، چاند کے کسی نرینہ سیارے میں ہونے پر، اس رسم کو ادا کیا جاتا تھا۔ اس دن عورت ورت (روزہ) رکھتی تھی۔ گھر کی عورتیں برگد کی چھال کو پیس کر اس کا رس نکالتی تھیں۔ رات کے وقت، منتروں کی تلاوت کے ساتھ، اس رس کی بوندیں حاملہ کے دائیں نتھنے میں ٹپکائی جاتی تھیں۔

درحقیقت اس رسم کے ذریعے تلی کی بیماریوں مثلاً طحال اور ورم طحال کو روکا جاتا تھا۔

رسمِ زلف آراستگی

حمل کے پانچویں مہینے میں بچّے کا ذہن تیار ہونے لگتا ہے۔ اس دوران حاملہ عورت کو خوش و خرم رکھنے سے پیٹ کے بچّے کی جسمانی اور ذہنی ساخت بہتر ہو جاتی ہے۔ عورت کو شادکام کرنے کی غرض سے رسمِ زلف آراستگی وجود میں آئی، جسے "سیمنتونین" کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ دو

لفظوں کے امتزاج سے بنا ہے ''سیمنت'' اور ''انین''۔ ''سیمنت'' کہتے ہیں سر کے بالوں کو اور ''انین'' کا مطلب ہے اوپر کی طرف اُٹھانا۔ مراد ہے آرائشِ زلف۔

اس رسم کی ادائیگی میں بھی عورت کو ورت (روزہ) رکھنا ہوتا تھا۔ گھر میں ہَون ہوتا تھا۔ ہَون کے دوران عورت مقدس آگ کے مغرب میں بیٹھتی تھی۔ اس کا شوہر اس کی زلفوں کو اوپر کی طرف اُٹھا کر ان کی آرائش کرتا تھا۔ اس کے بعد شوہر اس کی گردن گولر کی شاخ لپیٹ دیتا تھا۔ اس موقع پر رقص و موسیقی اس تقریب کا حصہ ہوتے تھے۔ جب تک ستارے نمودار نہیں ہوتے تھے عورت ''مون ورت'' رکھ کر مکمل خاموشی اختیار کیے رہتی تھی۔ تارے نکلنے پر، گائے کا بچھڑا چھونے سے اس کا 'مون ورت' ختم ہوتا تھا۔

رسمِ پیدائش

بچے کے پیدا ہوتے ہی رسمِ پیدائش کی تقریبات شروع ہو جاتی تھیں۔ اسے ''جات کرم سنسکار'' کہا جاتا تھا۔ اس رسم کے تین حصے ہوا کرتے تھے۔ پہلے حصے کو 'میدھا جنن'' (ذہنی ساخت) کہا جاتا تھا۔ بچہ پیدا ہونے کی اطلاع ملتے ہی اس کا والد زچہ گھر میں جا کر، سیدھے ہاتھ کی چوتھی انگلی اور سونے کی سلائی سے بچے کو گھی اور شہد چٹاتا تھا۔ اس موقع پر بچے کا ایک خفیہ نام رکھا جاتا تھا جس کا علم ماں باپ کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے حصے میں ''آیوشیہ'' (طویل عمری) کا عمل ہوتا تھا۔ بچے کی ناف یا اس کے دائیں کان کے پاس منہ کر کے اس کا باپ چند منتروں کی تلاوت کرتا تھا جن کا مقصد بچے کے لیے درازیٔ عمر کی دعا کرنا ہوتا تھا۔ اس کے بعد پانچ براہمنوں کو بلوا کر زچہ گھر میں لے جایا جاتا تھا جہاں وہ مختلف سمتوں سے بچے پر پھونک مارتے تھے۔ اسے 'پرشواس کرم' کہا جاتا تھا۔ تیسرے حصے میں ''بل'' (طاقت) کا عمل ہوتا تھا۔ اس میں بچے کا والد، بچے کے بہادر ہونے کے لیے مخصوص پوجا کرتا تھا۔ نرینہ اولاد ہونے کی صورت میں اس موقع پر ماں کے لیے تعریفی کلمات بھی کہے جاتے تھے۔ اس کے بعد بچے کی ناف (گُنڈی) کاٹ دی جاتی تھی اور بچے کو نہلایا جاتا تھا۔ اب بچہ پہلی بار ماں کا دودھ پیتا تھا۔

رسمِ چاہ

اوّل اوّل تو یہ رسم بچّے کو گھر سے باہر لانے تک ہی محدود تھی اور اسے ''نشکرمن'' کہا جاتا تھا۔ بچّے کی پیدائش کے بارھویں روز اسے پہلی بار گھر سے باہر لایا جاتا تھا۔ اس روز گھر میں آٹھوں سمتوں کے محافظین (اشٹ لوک پال)، سورج، چاند، واسدیو اور آکاش کی پوجا ہوتی تھی۔ پوجا کے بعد بچّے کا ماموں اسے گھر سے باہر، عام طور پر مندر تک لے جاتا تھا لیکن بعد کے زمانے میں یہ رسم ''ورُن دیوتا'' (فرشتۂ آب) سے منسوب ہوگئی۔ پوجا کے بعد بچّے اور اس کی ماں کو چاہ پر لے جایا جانے لگا جہاں ماں اور بچّے سے کنویں کی پرستش کرائی جاتی تھی۔

رسمِ طعم

بچّہ جب چھ ماہ کا ہوجاتا تھا تب پہلی بار اس کی زبان کو اناج کا ذائقہ دے کر اس کی شیرخواری بند کی جاتی تھی۔ اسے ''ان پراشن'' کہتے تھے۔ شمالی ہندوستان میں بچّے کے پہلا دانت نکالنے پر اس کے منہ کو جو کھوپاگری لگائی جاتی ہے، وہ اس رسم کا ہی جزوی روپ ہے۔ عہدِ قدیم میں اناج کو پکا کر اسے یَگیہ کی آگ سے پاک کیا جاتا تھا اور بچّے کے منہ سے لگا دیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بچّے کی شیرخواری بند ہوجاتی تھی۔ باوجود اس کے کہ موجودہ وقتوں کے کھوپاگری بچّے کے منہ سے لگانے میں رسمِ طعم کا بنیادی مقصد مضمر ہے، شیرخواری بند کرنے کا کوئی تعلق اس رسم کے ساتھ وابستہ نہیں رہا ہے۔

رسمِ ویدخوانی

زمانۂ قدیم میں بچّہ اس رسم کے ساتھ وید پڑھنا شروع کرتا تھا۔ اسے ''وید آرمبھ سنسکار'' کہا جاتا تھا۔ اس رسم کے دن استاد (آچاریہ) کو گھر پر مدعو کرکے اس سے ہَون کرایا جاتا تھا۔ استاد ہَون کی آگ کا طواف کرکے شاگرد کو ہَون استھان کے مغرب میں بٹھالیتا تھا۔ تب

استاد منتروں کی تلاوت کرتا تھا اور شاگرد مقدس آگ کو گھی اور سامگری کی آہوتیاں دیتا تھا۔
نذر و نیاز کے بعد استاد بچے کو وید پڑھانا شروع کرتا تھا۔

رسمِ واپسی

''سماورتن'' کے نام سے مشہور یہ رسم اس عہد میں ایجاد کی گئی تھی جس عہد میں طلبہ حصولِ تعلیم کے لیے علماء کی خانقاہوں میں جا کر رہا کرتے تھے۔ تعلیم مکمل کر کے جب شاگرد اپنے گھر کو لوٹتا تھا تب گھر لوٹنے سے پہلے وہ رشی کے آشرم میں اس رسم کو ادا کرتا تھا۔ جس روز یہ رسم ادا ہونا ہوتی تھی اس دن علی الصباح طالب علم کو ایک کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا۔ دوپہر کے وقت کمرا کھولا جاتا تھا اور طالب علم باہر آ کر استاد کی قدم بوسی کر کے اس سے اپنی تجریدی زندگی کے اختتام کی اجازت مانگتا تھا۔ استاد اس سے ہَون کراتا تھا۔ ہون کنڈ کے قریب پانی سے بھرے ہوئے آٹھ گھڑے رکھ دیے جاتے تھے۔ طالب علم ہر گھڑے میں سے پانی لے کر غسل کرتا تھا۔ اس غسل کے بعد وہ اپنے برہمچاری جیون (مجرد زندگی) کی علامتیں کمر بند، مرگ چھال اور ڈنڈا پھینک دیتا تھا اور نئی لنگوٹی پہن لیتا تھا۔ اس موقع پر طالب علم کے عزیز و اقارب موجود رہتے تھے۔ استاد کی اجازت سے وہ خوب صورت لباس پہن کر، استاد کو نذر نیاز پیش کر کے، رشتہ داروں کے ہمراہ گھر کو لوٹ آتا تھا۔

باب-۳

رسوماتِ عروسی

شادی کا موقع ہر قوم اور ہر سماج میں بڑا مبارک موقع مانا جاتا ہے لیکن اگر ہم ان رسومات پر غور کریں جو شادی کے موقع پر ادا کی جاتی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ صدیوں کی مسافرت کے بعد ہم تک پہنچنے والی یہ رسمیں قدیم معاشرے کی تاریخ اور اس کے تمدن کو آج بھی اپنے سینے میں محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ دراصل شادی کے ادارے کو ہی ابتدائی انسان کی دو ضرورتوں نے جنم دیا تھا۔ پہلی ضرورت تھی جسمانی ضرورت، جسے جماع کی خواہش کہا جاسکتا ہے۔ دوسری تھی خانگی ضرورت، جسے اولاد کہا جاسکتا ہے۔ غیر مہذب معاشرے میں چوں کہ عورت بھی مرد کی طرح اپنی جسمانی طاقت کے بل پر ہی زندہ رہا کرتی تھی، اس لیے وہ کسی بھی مرد کے ساتھ ہم بستری کرنے سے پہلے زچگی کے دوران کمزور پڑنے والے اپنے جسم کی اور پیدا ہونے والے بچّے کی حفاظت کا یقین کرلینا چاہتی تھی۔ اسی طرح غیر مہذب مرد بھی اپنی اولاد کے لیے ابتدائی خوراک اور اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک مربوط اور مضبوط رشتے کا آرزومند ہوتا تھا۔ نتیجے کے طور پر شادی کی متعدد صورتیں وجود میں آنا شروع ہوئیں۔ تہذیب یافتہ سماج نے اس نسبت پر دھرم کی مُہر لگا کر اسے رسموں اور رواجوں کے بندھن میں جکڑ دیا تا کہ دو جسموں کا یہ تعلق پائیدار ہو سکے۔ چوں کہ مندرجہ بالا دونوں ضروریات دائمی اور عمومی ہیں، اس لیے ابتدائی زمانے سے لے کر آج تک شادی کا ادارہ کمزور نہیں پڑا ہے۔ مستقبل میں بھی اس ادارے کو زوال کا کوئی خدشہ درپیش دکھائی نہیں دیتا ہے۔ لہٰذا شادی سے متعلق رسومات کی تہہ میں قدیم رسومات کے بیجوں کا موجود ہونا ایک قدرتی عمل ہے۔ باوجود اس کے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان رسومات کی صورت تبدیل ہوتی رہی ہے لیکن کوئی تبدیلی بھی شادی کے ادارے کو متاثر نہیں کرسکی ہے۔ ذیل میں ہم شادی سے متعلق رسومات پر گفتگو کریں گے۔

رسمِ فرس نشینی

شادی کے موقع پر گھوڑی چڑھنے کی رسم درحقیقت عہدِ قدیم کی اس رسم کی یادگار ہے، جسے منو نے ''راکشس وِواہ'' کا نام دیا تھا۔ دورِ حاضر کی یہ مقبولِ عام رسم، جسے بڑی دھوم دھام کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے، اصل میں ہمارے موجودہ مہذب معاشرے تک ہماری بے خیالی کے باعث چلی آئی ہے، ورنہ تہذیب یافتہ معاشرے میں عفریت جیسی معیوب رسم کا مروج رہنا ممکن نہیں تھا۔ فرس نشینی کی رسم کا تعلق اس دور سے ہے جب دولہا، اپنے زورِ بازو سے، تلوار کی طاقت سے، لڑکی اُٹھا کر لایا کرتا تھا۔ منو نے اسی لیے اسے عفریت سے معنون کیا ہے کیوں کہ ان کے مطابق جب لڑکی والوں کو مار پیٹ کر، زخمی کر کے، زبردستی لڑکی اُٹھا لائی جاتی ہے اور اسے بیوی کے طور پر رکھ لیا جاتا ہے تو عفریتی شادی یعنی راکشس وِواہ ہوتا ہے۔ دورِ حاضر میں نوشہ کا گھوڑی پر سوار ہونا، تلوار پکڑنا، سہرا باندھنا، برات لے کر چلنا اور دلہن کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے تلوار سے چراغ بجھانا جیسی رسموں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ فرس نشینی کی یہ رسم عفریتی شادی کی تبدیل شدہ صورت ہی ہے۔

قدیم ادب میں اگرچہ فرس نشینی کا ذکر دستیاب نہیں ہے لیکن عفریتی شادی کی دستیاب تفاصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ دولہا گھوڑی یا گھوڑے پر سوار ہو کر ہی دلہن کو لینے کے لیے نکلتا تھا۔ ویدوں کے زمانے میں وِمد اور پوروِمتر کی شادی عفریتی طریقے ہی سے ہوئی تھی۔ مہابھارت کے زمانے میں بھیشم پتامہ اسی طریقے سے کورو شہزادوں کے لیے بیویاں لائے تھے۔ راجپوتی عہد میں پرتھوی راج اور سنجوگتا کی شادی بھی اسی طرز پر ہوئی تھی۔

موجودہ وقتوں میں گھوڑی چڑھنے سے پہلے دولہے کو نہلا دھلا کر خوب صورت لباس پہنایا جاتا ہے۔ وہ اپنے عزیز و اقارب کی موجودگی میں دستار پہن کر سہرا باندھتا ہے۔ سہرا باندھنے سے پہلے اس کے ماتھے پر افسر باندھا جاتا ہے جو حفاظتِ جبہہ کے لیے نہایت ضروری سمجھا جاتا تھا۔ سہرے میں چھپا ہوا چہرہ بھی دراصل روپوشی ہی ہے جسے فوجی زبان میں ''کیموفلاجنگ'' کہا جا سکتا ہے۔ عزیز و اقارب پر مشتمل برات بھی دراصل فوج ہی ہوا کرتی تھی جو نوشہ کی امداد کے لیے ساتھ جاتی تھی۔ اب چوں کہ عفریتی شادی مفقود ہو چکی ہے، اس لیے شادی کے مبارک موقع پر سہرا، افسر، برات جیسی چیزیں خوشی کی علامت بن گئی ہیں۔

سہرا باندھ کر نوشہ تلوار پکڑتا ہے۔اس کے گھوڑی پر بیٹھنے سے پہلے اس کی بہنیں گھوڑی کی باگ گوندھتی ہیں۔یہ رسم گھوڑی کے بناؤ سنگھار کے لیے جاری ہوئی تھی۔ چلنے سے پہلے گھوڑی کو دانہ کھلایا جاتا ہے کہ کہیں بھوک کی وجہ سے اس کی رفتار سست نہ پڑ جائے۔فرس نشینی کے بعد دولہا اس وقت تک گھر نہیں لوٹتا جب تک وہ دلہن نہ لے آئے۔فرس نشین بیٹے کی پیٹھ دیکھنے کے بعد اس کی والدہ تب تک اس کا منہ نہیں دیکھتی جب تک وہ دلہن نہیں لے آتا۔آج کل بھی اگر اُس شہر کے راستے میں کوئی دریا پڑتا ہو، جہاں سے دلہن کو لانا ہوتا ہے تو برات اگلی صبح ہی روانہ ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں فرس نشینی کی رات دولہا اپنے گھر پر نہیں گزارتا بلکہ اپنے ہی شہر میں کسی دوسرے مقام پر شب گزارتا ہے۔

مہذب معاشرے میں جب اس عفریتی رسم کو خوشی کی علامت کے طور پر مروج رکھا گیا اور اس کے اوپر دھرم کی چھاپ لگادی گئی تو اس رسم کے ساتھ ایک اور ریت بھی وابستہ ہوگئی۔ وہ یہ کہ دولہے کے ساتھ اس کا کوئی بھائی بھتیجا بھی گھوڑی پر بیٹھنے لگا۔اسے ''شہ بالا'' یا ''سربالا'' کہتے ہیں۔اس ریت کی ابتدا میں کسی اگلے بچے کو ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار کرنے اور اسے رسوماتِ عروسی کو قریب سے دیکھنے سمجھنے کا موقع فراہم کرنے کا منشا رہا ہوگا۔موجودہ زمانے میں یہ ریت بھی رسمِ فرس نشینی کا ایک جزوِ تکلف بن کر رہ گئی ہے۔شادی سے متعلق دیگر رسومات میں شہ بالا کا کوئی مقام نہیں ہے۔

موجودہ معاشرے کے تہذیب یافتہ ہونے کے باوجود دولہا دلہن کے گھر پہنچ کر بعض ایسی رسمیں ادا کرتا ہے جن کی بنیاد میں قدیم غیر مہذب رسموں کے بیج موجود ہیں۔گونڈوں میں شادی کی آخری رسم یہ ہے کہ دلہن شادی کے منڈپ سے اُٹھ کر بھاگتی ہے اور دولہا اس کے پیچھے بھاگ کر اسے پکڑتا ہے۔ پنجابی سماج میں شادی کے بعد چھڑیوں کا کھیل بھی ڈنڈے کے زور سے بیوی لانے کے مترادف ہے۔اپنے طویل تاریخی پس منظر کے باوجود رسمِ فرس نشینی، عصر حاضر میں، شادمانی و شادکامی کی علامت بن کر نئے معانی حاصل کر چکی ہے۔ باجے گاجے کے ساتھ، ناچتے گاتے ہوئے دولہا کے دوست احباب، رشتہ دار اس موقع پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہیں اور ہمارے اجتماعی لاشعور سے وابستگی کے باعث یہ رسم انتہائی مقبول عام رسم بنی ہوئی ہے۔

رسمِ خانہ آبادی

قدیم زمانے میں آٹھ قسم کی شادیاں مرّوج تھیں۔ ان میں سے کسی بھی طریقے سے انجام پانے والی شادی سماجی اور قانونی طور پر جائز تسلیم کی جاتی تھی۔ شادی کی یہ قسمیں مندرجہ ذیل تھیں۔

(۱) شیطانی شادی

دھوکے سے، بہلا پھسلا کر یا سوتے میں لڑکی کو اُٹھا لانے کے بعد اسے بیوی بنا کر رکھنے کو ''پیشاچ وِواہ'' یعنی شیطانی شادی کہا جاتا تھا۔

(۲) عفریتی شادی

تلوار کے زور سے لڑکی کو اس کے والد کے گھر سے اُٹھا کر لانے کے بعد اسے بیوی بنانے کو ''راکشس وِواہ'' یعنی عفریتی شادی کہا جاتا تھا۔

(۳) نغماتی شادی

جب لڑکی کی رضامندی سے لیکن اس کے والدین کی مرضی کے خلاف لڑکی کو اغوا کر کے لاتے تھے اور اسے بیوی بنا لیتے تھے تب ان کی شادی ''گاندھرو وِواہ'' یعنی نغماتی شادی کہلاتی تھی۔

(۴) جنّاتی شادی

لڑکی کے والدین کو اس کی قیمت دے کر جب دولہا اسے بیوی بناتا تھا تو اس شادی کو ''آسور وِواہ'' یعنی جنّاتی شادی کہا جاتا تھا۔

(۵) رُعاتی شادی

جب لڑکی کا باپ خود اس کے لیے موزوں رشتہ تلاش کر کے اپنے ہاتھ سے لڑکی کو وداع کرتا تھا تب ''پراجاپتیہ وِواہ'' یعنی رُعاتی شادی قرار پاتی تھی۔

(۶) مرتاضی شادی

جس شادی میں لڑکی کا مول تول تو نہیں کیا جاتا تھا لیکن شادی کے تمام اخراجات

لڑکے والے ادا کرتے تھے، اسے ''آرش وِواہ'' یعنی مرتاضی شادی کہا جاتا تھا۔

(۷) ملکی شادی

جس شادی میں بیوی کے ساتھ خادمائیں بھی لائی جاتی تھیں اور انھیں داشتہ کے طور پر رکھا جاتا تھا، اسے ''دیو وِواہ'' یعنی ملکی شادی کہتے تھے۔

(۸) خدائی شادی

جس شادی میں لڑکی کے والدین حسب حیثیت جہیز دے کر اپنے ہاتھوں بیٹی کو وداع کرتے تھے، اسے ''براہم وِواہ'' یعنی خدائی شادی کہا جاتا تھا۔

صدیوں کی مسافرت کے بعد شادی کی جو قسم ہمارے موجودہ معاشرے تک پہنچی ہے، وہ خدائی شادی ہے۔ مذہبی، تمدنی اور ثقافتی رسموں رواجوں سے لدی ہوئی یہ رسمِ خانہ آبادی ایسی متعدد رِیتوں سے آراستہ ہے کہ ہر رِیت اپنی جگہ ایک علامت بنی ہوئی ہے۔ ذہنی ارتقا کے اس دور میں اگرچہ یہ رِیتیں مذاق سا معلوم ہوتی ہیں لیکن ہمارے اجتماعی شعور میں ان کی تقدیس ایسی گہری اُتری ہوئی ہے کہ ہم ان رِیتوں رواجوں کے بغیر شادی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔

رسمِ خانہ آبادی کے ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سے طے شدہ دن کے مطابق دولہا دلہن کے گھر آتا ہے جہاں شادی کا منڈپ تیار کیا ہوا ہوتا ہے۔ منڈپ میں بیٹھ کر وہ آگ اور دیوتاؤں کی پوجا کرتا ہے۔ اسی آگ کو گواہ بنا کر وہ دلہن کے والد سے لڑکی کا ہاتھ قبول کرتا ہے۔ چار بار دلہن کے ہمراہ آگ کا طواف کر کے وہ دلہن کو اپنی بیوی بنانے کی پیش کش کرتا ہے۔ اسے ''چارلاما''، ''پھیرے'' یا ''بھانور'' کہتے ہیں۔ دلہن، جو ابھی تک اس کی دائیں جانب بیٹھی ہوتی ہے اور اس کی بیوی نہیں بنی ہوتی ہے، اس کی پیش کش کو منظور کرنے سے پہلے اس سے سات وعدے لیتی ہے۔ اسے ''سپتپدی'' کہتے ہیں۔ ان وعدوں کے ذریعے سے وہ اس سے اقرار لیتی ہے کہ وہ اس کی رضامندی کے بغیر کوئی یگیہ نہیں کرے گا، فیضِ عام کے وسائل (مثلاً کنواں، تالاب وغیرہ) تعمیر نہیں کرائے گا، مقدس مقامات کی زیارت کو نہیں جائے گا، مویشی نہیں خریدے گا، کوئی موسمی کھیل نہیں کھیلے گا، دوسرے لوگوں کی موجودگی میں اس سے تلخ کلامی نہیں کرے گا اور کسی دوسری عورت کے ساتھ جنسی تعلق نہیں رکھے گا۔ اس طرح ہندو عورت بجائے مرد کی غلامی قبول کرنے کے، اس کی شریکِ حیات (اردھانگنی) بنا قبول کرتی ہے۔ ان شرائط کو منظور کر کے دولہا بھی اپنی پانچ شرطیں دلہن سے منواتا ہے کہ وہ

ہمیشہ اسے رائی (وشنو روپ) تصور کرے گی، اس کی رضامندی کے بغیر کھانے، پینے یا پہننے میں من مانی نہیں کرے گی، اپنے اعلیٰ کردار سے دونوں خاندانوں کا نام روشن کرے گی، شوہر کے والدین اور دیگر اہلِ خاندان کی خدمت کرے گی اور اس کی بیوی بن کر صدق و شرافت کی زندگی بسر کرے گی۔ اس طریقہ سے مرد، بہت ہوشیاری کے ساتھ، عورت پر برتری حاصل کرلیتا ہے۔

دولہا اور دلہن جب ایک دوسرے کی شرطیں منظور کر لیتے ہیں تو دلہن اپنی جگہ سے اٹھ کر دولہا کی بائیں طرف آ بیٹھتی ہے اور اس کی بیوی بن جاتی ہے۔ شرطیں منظور کرنا اس حقیقت کا مظہر ہے کہ آریوں کے معاشرے میں ازدواجی زندگی میں مرد اور عورت کو برابر کا درجہ حاصل تھا چوں کہ دونوں کی رضامندی، محبت اور یگانگت کے بغیر ازدواجی زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی۔

رسمِ جہیز

جب سے مہذب معاشرے نے شادی کے خدائی (براہم) روپ کو قبول کیا ہے، تب سے ہی شادی کے موقع پر لڑکی کو جہیز دینے کی رسم بھی رائج ہے۔ اولین قانون ساز منو نے آبائی جائیداد میں بیٹی کا حصہ اس طرح متعین کیا تھا کہ بیٹے کے حصے کا ایک چوتھائی بیٹی کو جہیز کی صورت میں دیا جائے۔ شادی کے بعد دختر کا آبائی جائیداد میں کوئی حق یا حصہ باقی نہیں رہتا تھا۔ منو کا بنایا ہوا یہ قانون ہندو سماج میں شادی کی ایک اہم رسم بن گیا جسے مختلف علاقوں میں ''دہیز دان''، ''جھاپنی داج''، ''دوتسر'' وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اس رسم کا ایک مقبولِ عام نام ''کھٹ دان'' ہے۔ اگر چہ رگ وید میں سوم اور سوریا کی شادی میں جہیز دیئے جانے کا ذکر موجود ہے لیکن میرے خیال میں کھٹ دان کی موجودہ رسم ویدوں جتنی پرانی رسم نہیں ہے۔ یہ رسم مہذب معاشرے کے ترقی یافتہ عہد میں شروع ہوئی ہوگی۔

لفظ ''کھٹ''، کھاٹ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ شادی کے موقع پر لڑکی کے والدین جو کچھ اپنی بیٹی کو دینا چاہتے تھے، اس سامان کو کھاٹ پر بچھا دیتے تھے۔ دولہا اور دلہن اس سامان کا پھیرا لگا کر اسے قبول کرتے تھے۔ چوں کہ یہی سامان بعد میں ٹوکریوں میں رکھ کر لڑکی کے سسرال بھیجا جاتا تھا، اس لیے اسے ''جھاپنی داج'' کہا گیا۔ آگے چل کر ایک اور روایت اس رسم کے ساتھ منسلک ہوگئی کہ جہیز کے سامان کے علاوہ ایک تھالی میں کچھ روپے پیسے رکھ کر لڑکی کا باپ

لڑکے کے باپ کو دیتا تھا۔ لڑکے کا باپ تعظیماً تھالی کو سر پر رکھ لیتا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس نے جہیز کو بخوشی قبول کرلیا ہے۔ اسے ''دات'' کہا جاتا تھا۔ اس ریت نے روپے پیسوں کو ہی جہیز کی علامت بنادیا۔ موجودہ وقتوں میں تھالی پیش کرنے کی رسم تو متعدد علاقوں میں رائج ہے لیکن کھاٹ پر جہیز بچھانے کی رسم تقریباً ختم ہوچکی ہے۔ آج کل جہیز میں دیئے جارہے صوفے یا ڈبل بیڈ پر ہی دولہا دلہن کو بٹھا کر یہ رسم ادا کردی جاتی ہے۔

یہاں کھٹ لفظ کا استعمال ایک دوسرے معنی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ وہ ہے کھٹنا یعنی کمائی۔ مہذب سماج نے جہیز کو لڑکی کے والدین پر بار بنانے کے بجائے اسے لڑکی کی کمائی کہنا زیادہ مناسب خیال کیا۔ غرضیکہ جو کچھ بطور جہیز لڑکی کو دیا جارہا ہے، اس میں نہ تو احسان کا جذبہ شامل ہے اور نہ اسے تاوان سمجھ کر دیا جارہا ہے بلکہ اسے لڑکی نے اپنی شادی کے ساتھ اپنے قدرتی حق کے طور پر حاصل کیا ہے۔ یہاں ''کھاٹ'' لفظ کا استعمال دو مزید پہلوؤں سے بھی اہم ہوجاتا ہے۔ اوّل یہ کہ شادی کا ادارہ ہی آدمی کی جماعی جس اور خواہشِ اولاد سے وابستہ ہے۔ اس کی سیدھی سادی علامت کھاٹ ہی بنتی ہے۔ موجودہ وقتوں میں بھی جہیز کے سامان میں ڈبل بیڈ یا دو بستروں کا دیا جانا اسی علامتی معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دوسرا پہلو ہے سماجی اعلان کا۔ کھاٹ پر بچھے ہوئے سامان کو (تعظیماً زمین سے اونچا رکھ کر) بلاوا دے کر برادری کو دکھایا جاتا تھا تاکہ سماج کو یہ معلوم ہوجائے کہ لڑکی کو اس کا حصّہ دے دیا گیا ہے۔

جہیز سے متعلق ریتوں میں ایک اور ریت بھی شامل ہے جسے ''دھان بونا'' کہا جاتا ہے۔ جس وقت دولہا دلہن جہیز کا پھیرا لگا رہے ہوتے ہیں اس وقت ان پر دھان، چاول یا کھیلیں برسائی جاتی ہیں۔ اسے ''دھان بونا'' کہتے ہیں۔ اس ریت کی ابتدا میں بھی دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ پہلی یہ کہ دھان بونا اولاد پیدا کرنے کی علامت ہے اور دوسری یہ کہ لڑکی کو وداع کرنے کے بعد بھی اس کے والدین اپنی خوشحالی کا ثبوت دیتے ہیں۔

اب چوں کہ ہندو کوڈ بل میں ترمیم ہوچکی ہے جس کی رو سے شادی کے بعد بھی لڑکی اپنے باپ کی جائیداد میں حصہ دار رہتی ہے، اس لیے رسمِ جہیز سماج سے اٹھتی جارہی ہے۔ جہیز مخالف تحریک سے بھی اس رسم کو بڑی زد پہنچی ہے۔ لہٰذا اب جہیز کی نمائش نہیں کی جاتی بلکہ مخفی طور پر جہیز کی ادائیگی میں لڑکی کا باپ اس سامان کی فہرست لڑکے کے باپ کو پیش کرتا ہے جو جہیز میں شامل ہوتا ہے۔

عوامی رسومات

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں متعنہ مذہبی رسومات کے ساتھ ساتھ شادی بیاہ کے موقع پر متعدد عوامی رسومات بھی مقبول ہیں۔ مختلف علاقوں اور مختلف ذاتوں میں مختلف قسم کی عوامی رسمیں رائج ہیں۔ مذہبی رسومات کی طرح عوامی رسومات بھی اگرچہ موجودہ وقتوں میں اپنی اہمیت کھو چکی ہیں اور ان کا چلن روایت کے طور پر ہی جاری ہے لیکن کسی زمانے میں ان کی اہمیت اور افادیت مسلّم ہوا کرتی تھی۔ تغیراتِ زمانہ نے ان میں سے بعض رسموں کو بے معنی اور بے کار بنا دیا ہے۔ علاقائی اختلاف کے باوجود ان رسموں میں جغرافیائی، سماجی اور روحانی ضروریات کے اس دھارے کو دیکھا جاسکتا ہے جو ہمارے تہذیبی ورثے کی شناخت میں معاون ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم شادی سے متعلق عوامی رسومات درج کریں گے۔

رسمِ نسبت

پرانے زمانے میں تو لڑکا، اپنے عزیز واقارب کو ساتھ لے کر لڑکی کے گھر جاکر، خود لڑکی سے شادی کی پیش کش کیا کرتا تھا۔ اس پیش کش کو منظور یا نامنظور کرنے کا حق بھی صرف لڑکی ہی کو حاصل ہوا کرتا تھا۔ بعد کے زمانے میں لڑکی کا باپ لڑکے والوں کے پاس رشتہ مانگنے جانے لگا اور منظوری کا حق لڑکے کے والد کو مل گیا۔ دورِ جدید میں لڑکے کا لڑکی کو دیکھ کر پسند کرنا اور اس کے والد سے شگون قبول کرنا بھی اس رسم میں شامل ہوگیا ہے۔ موجودہ وقتوں میں اس رسم کی دوصورتیں مروج ہیں-- ''روک'' اور ''منگنی''۔ ''روک'' جسے رکائی یا ٹھاکا بھی کہتے ہیں، کے ذریعے شگون وغیرہ دے کر لڑکے والوں سے اقرار لیا جاتا ہے اور منگنی کے ذریعے دوبارہ شگون اور تحائف دے کر اس اقرار کی تصدیق کی جاتی ہے۔ اسے ''تلک'' یا ''ٹیکا'' بھی کہا جاتا ہے۔

دورِ حاضرہ کی رسمِ نسبت عہدِ قدیم کی رسمِ نسبت کی ضد ہوگئی ہے۔ آج کل لڑکی والے لڑکے کے گھر پر جاکر رشتہ مانگتے ہیں۔ معاملہ طے ہوجانے پر لڑکی والے ہی لڑکے کو شگون اور تحائف دیتے ہیں، حالاں کہ اپنی ابتدا میں یہ رسم صرف زبان دینے (واگ دان) تک ہی محدود تھی جس میں لڑکی یا اس کے والدین لڑکے کو یا اس کے والدین کو، ان کی پیش کش منظور کر کے زبان دیا کرتے تھے۔

رسمِ امن واماں

شادی کی تقاریب شروع کرنے سے پہلے دولہے کے ننہال والے رسمِ امن واماں ادا کرتے ہیں، جسے ''سانت'' ''شانت'' یا ''شانتی کرم'' کہا جاتا ہے۔ ہندو معاشرے میں چوں کہ شادی کی رسم کو مذہبی فریضے کے طور پر ادا کیا جاتا ہے اور چوں کہ ہندوؤں میں ہر مذہبی تقریب شانتی کرم سے شروع ہوتی ہے، اس لیے شادی کی کسی بھی تقریب سے پہلے رسمِ امن واماں کا ادا کرنا لازمی ہوتا ہے۔ اس رسم میں ہون کے ذریعے خدا سے دعا کی جاتی ہے کہ رسوماتِ عروسی کے دوران گھر، کنبہ، بستی اور علاقے میں ہر جگہ امن واماں رہے، کوئی بیمار نہ پڑے، کوئی حادثہ نہ ہو، کسی کی موت نہ ہو، بارش یا آندھی نہ آئے، کہیں جھگڑا فساد نہ ہو۔ رسمِ امن واماں دلہا اور دلہن دونوں کے ہاں ادا کی جاتی ہے۔ دولہا کو چوں کہ برات لے کر بالعموم کسی دوسرے شہر کے لیے روانہ ہونا ہوتا ہے اس لیے اس کے ہاں یہ رسم سہرا بندی سے پہلے ادا کی جاتی ہے۔ دلہن کے ہاں یہ رسم اس وقت ادا کی جاتی ہے جب دولہا برات کے ساتھ اس کے شہر میں داخل ہوتا ہے۔ دونوں گھروں میں یہ رسم ننہال کی طرف سے ہی ادا کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد پدری رشتوں کی موجودگی میں مادری رشتوں کو اہمیت دینا ہے۔

رسمِ چھتر سازی

ہندو معاشرے میں کسی بھی مذہبی تقریب کا کھلے آسمان کے نیچے منعقد ہونا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مذہبی احکام میں بھی اس کی اجازت نہیں ہے کہ کسی مذہبی رسم کو بغیر منڈپ کے ادا کیا جائے۔ اس لیے عہد قدیم میں راجے مہاراجے یگیہ سے پہلے یگیہ منڈپ تعمیر کراتے تھے۔ منڈپ کی تعمیر ہر شخص کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے عوام میں علامتی منڈپ تیار کرنا مروّج ہوگیا۔ اس کی دو صورتیں ظہور میں آئیں۔ اوّل یہ کہ جو شخص مذہبی رسم ادا کر رہا ہو، اس کے سر پر چھتر کا انتظام کر دیا جائے یا کوئی کپڑا سر کے اوپر تان دیا جائے۔ دوسری یہ کہ منڈپ کی علامت کے پور پر رسیوں کو سائبان کی شکل میں باندھ دیا جائے۔ شادی بیاہ کے موقعے پر دوسری صورت ہی مروّج ہے جسے ''تنی تنا'' کہتے ہیں۔

مونج کی تین رسیوں کے درمیان چار چٹیاں باندھ دی جاتی ہیں اور ان رسیوں کو عام طور پر گھر کے آنگن میں تین کونوں میں اس طرح باندھ دیا جاتا ہے کہ چٹیاں بیچ آنگن کے لٹک جائیں۔ اسی کو چھتر سازی کہتے ہیں۔ اکثر اوقات اس رسم کو کسی براہمن کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے، جو منتروں کی تلاوت کے ساتھ چھتر سازی کرتا ہے۔

رسمِ تن آرائی

شادی کے موقع پر دولہا اور دلہن کو خوبصورت بنانے کے لیے جو رسم ادا کی جاتی ہے، اسے مختلف علاقوں میں ''ادورتن''، ''اُبٹن''، ''بنا بنٹا''، ''مانجھا''، ''مایَیاں'' وغیرہ ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ اس رسم کا اصل مقصد دولہا دلہن کے جسموں کو مانج کر دیدہ زیب بنانا ہے۔ مختلف علاقوں میں اس رسم کو علاقائی رواج کے مطابق ادا کیا جاتا ہے۔ عام طور پر ہلدی، مجیٹھ، بیسن، گھی، اگر اور صندل کے برادے کو ملا کر ابٹن تیار کیا جاتا ہے۔ اسی ابٹن کو دولہا دلہن کے جسم پر ملا جاتا ہے۔ اس کے ملنے سے جسم کا میل چھوٹتا ہے اور بدن پر نکھار آتا ہے۔

پرانے زمانے میں تو رواج یہ تھا کہ شادی کے بہت پہلے ہی سے لڑکے اور لڑکی کو ہر روز ابٹن لگایا جاتا تھا۔ پھر ابٹن لگانے کا سلسلہ چالیس روز تک محدود ہوگیا۔ چالیس سے کم ہوتے ہوتے دنوں کی تعداد سات، سات سے تین اور تین سے ایک ہوگئی۔ دورِ حاضر میں اکثر علاقوں میں تو رسم تن آرائی ہی ختم ہو چکی ہے۔ جن علاقوں میں یہ رواج ابھی باقی ہے، وہاں بھی علامتی طور پر، ذرا سا ابٹن دولہا دلہن کے ہاتھ، ماتھے یا چہرے پر لگا کر رسم ادا کر دی جاتی ہے۔ جسم کو نکھارنے کے لیے آج کے نوجوانوں کو قدرتی اشیاء کے استعمال میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

روایتی ڈھنگ سے تیار کیے گئے ابٹن میں ہلدی، مجیٹھ اور بیسن جسم کا میل چھڑانے کا کام کرتے ہیں۔ گھی سے جسم کی خشکی دور ہوتی ہے۔ اگر اور صندل کا برادہ جسم کو معطر کرتا ہے۔

رسمِ سوار

ہندو مذہب میں شادی کو جنسی تعلقات تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اسے سماجی ذمہ داری کا

ایک اہم فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا شادی کے ساتھ ہی آدمی کا داعی روپ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی کتابوں میں دولہا کو ''وِشنو روپ'' (پرورش کرنے والا) اور دلہن کو ''لکشمی روپ'' (خوشحالی) قرار دیا گیا ہے۔ اس تصور کے تئیں عوام کی تقدیس کا عالم یہ ہے کہ شادی کی رسومات میں دولہا کا خسر، اسے داماد سمجھ کر دعائے خیر دینے کے بجائے، اسے وشنو روپ مان کراس کے پاؤں دھوتا ہے۔

برات کے روانہ ہونے سے پہلے دولہے کو داعی (پالک) روپ دے دیا جاتا ہے تاکہ وہ یہ محسوس کرے کہ آج سے اس کی سماجی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا ہے اور اسے وِشنو کی طرح اپنی بیوی (ازاں بعد بچوں) کی پرورش کرنا ہے۔ دولہا کو اس احساس سے ہمکنار کرنے کے لیے رسمِ سوار کے ذریعے اس کی کلائی پر وِشنو کی نشانیاں باندھ دی جاتی ہیں۔ اسی کو ''بازو بند''، ''کنکن''، ''کنگن''، ''کنگنا'' یا ''گانہ'' کہا جاتا ہے۔ کنگن تیار کرنے میں مولی (رنگین تاگے) کی ڈوری میں ایک کوڑی پروئی جاتی ہے، جو وشنو کے ناقوس (شنکھ) کی علامت ہے۔ سبز سرسوں کی پوٹلی پروئی جاتی ہے، جو وشنو کی گُرز مد ورلوہا پرویا جاتا ہے، جو وشنو کے سلاح کرہ (چکّر) کی علامت ہے۔ وشنو کی چوتھی نشانی یدِ علیا (ورَدہست) ہے، اس لیے کنگن کو ہاتھ کے اوپر یعنی کلائی ہی سے باندھا جاتا ہے تاکہ باقی علامتوں میں ہاتھ بھی بطور علامت شامل رہے۔ بعد کے زمانے میں ایک پیسہ بھی کنگن میں پرویا جانے لگا جو لکشمی (دولت) کی علامت ہے۔

رسمِ پیشوائی

منو کی اصطفائی شادیوں میں سے جب ہندوستانی معاشرے میں خدائی شادی (براہم وِواہ) مقبول ہوئی تو اس کے ساتھ ہی رسمِ پیشوائی بھی جاری ہوگئی۔ خدائی شادی میں دلہن کا والد، دولہا اور اس کے عزیز واقارب کو اپنے گھر پر آنے کی دعوت دیتا ہے اور ان کی آمد پر اپنے عزیز واقارب کے ساتھ ان کا استقبال کرتا ہے۔ عرفِ عام میں اسے ''ملنی'' کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر دولہا اور دلہن کے والد، چاچا، ماموں، دادا، بھائی، بہنوئی وغیرہ آپس میں گلے ملتے ہیں اور ایک دوسرے کی گلپوشی کرتے ہیں۔ دلہن کے رشتہ دار دولہا کے رشتہ داروں کی عزت افزائی کے لیے انھیں کپڑے یا روپے بھی پیش کرتے ہیں۔

رسمِ چراغ پرویزن

یہ رسم اس زمانے کی پیداوار ہے جب لڑکی یا اس کے والدین خود لڑکا تلاش نہیں کرتے تھے بلکہ یہ کام نائی یا پروہت کے ذمہ ہوا کرتا تھا۔ اس صورت میں لڑکے کے بارے میں براہِ راست کچھ بھی معلومات ان کو حاصل نہیں ہوتی تھیں۔ اس سے متعلق تمام معلومات بلاواسطہ ان تک پہنچتی تھیں۔ اُس زمانے میں دولہا جب شادی کے لیے دلہن کے گھر پر آتا تھا تو اس کے بارے میں موصول اطلاعات کی تصدیق کے لیے بعض رسمیں وجود میں آگئیں۔ ان رسموں کے توسل سے، ایک طرح سے دولہے کا امتحان لیا جاتا تھا اور یہ اطمینان کیا جاتا تھا کہ نائی یا پروہت کا انتخاب غلط نہیں ہے۔ ان رسوم میں رسمِ چراغ پرویزن دولہا کی اوّلین آزمائش ہوا کرتی تھی۔ دولہے کی آمد سے پہلے دلہن کے گھر کے دروازے پر ایک چھلنی لٹکا کر اس میں چراغ جلا دیا جاتا تھا۔ دولہا کو، تلوار کے ایک ہی وار میں، چھلنی کو چیر کر دیا بجھانا ہوتا تھا۔ اس کے ذریعے یہ اطمینان مقصود ہوتا تھا کہ نوشہ کی بینائی درست ہے اور اسے تلوار چلانا آتا ہے۔ کسی زمانے میں اس رسم کا عالم یہ تھا کہ اگر تلوار کے ایک ہی وار میں نوشہ سے دیا نہ بجھتا تو برات لوٹا دی جاتی تھی مگر بعد کے زمانے میں اسے بدشگونی سمجھا جانے لگا اور اس کے ازالہ کے طور پر شادی کی رسموں میں ایک اضافی پوجا شامل کی جانے لگی۔ موجودہ وقتوں میں یہ رسم روایت کے طور پر ہی بعض علاقوں میں باقی ہے۔ اسے عوامی زبان میں ''دِیا چھلنی''، ''دیوا چھلنی''، ''دیا چھالنی'' وغیرہ کہا جاتا ہے۔

رسمِ پیمائش

یہ رسم بھی اسی زمانے کی دین ہے جب ازدواجی رشتے نائی یا پروہت کے ذریعے طے ہوا کرتے تھے۔ دلہن اور اس کے رشتہ دار لڑکے کی صورت اس وقت ہی دیکھتے تھے جب وہ دولہا بن کر آتا تھا۔ یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ لڑکے کے جسم کے تمام اعضا صحیح سلامت ہیں، رسمِ پیمائش وضع کی گئی۔ دولہے کے دروازے پر آتے ہی دلہن کی والدہ اپنے دوپٹے سے اسے سر سے پاؤں تک چھوتی ہے۔ اسے ''منتی''، ''ناپ''، ''ماپ'' وغیرہ کہا جاتا ہے اس رسم کے

ذریعے ایک مہذب طریقے سے، دولہے کے صحت مند ہونے اور اس کے اعضا کے درست ہونے کا اطمینان کیا جاتا تھا۔

رسمِ تطوقِ نصرتی

یہ رسم نغماتی شادی (گاندھرو وِواہ) کی دین ہے۔ جس زمانے میں لڑکی اپنے لیے خود شوہر کا انتخاب کرتی تھی، اس زمانے میں لڑکا پہلے کسی شرط کو پورا کر کے (سوئمبر) لڑکی کو فتح کرتا تھا اور بعدازاں اس سے شادی کرتا تھا۔ شرط پوری ہونے پر لڑکی اس کی گل پوشی کر کے اس سے شادی کا اقرار کرتی تھی۔ اسے تطوقِ نصرتی یعنی ''جے مالا'' کہا جاتا تھا۔ حالیہ وقتوں میں یہ رسم روایت کے طور پر ہی ادا ہو رہی ہے چوں کہ فی زمانہ سوئمبر کا چلن مفقود ہے۔ آج کل جسے ''جے مالا'' (تطوقِ نصرتی) کہا جاتا ہے، وہ دراصل ''وَرمالا'' (تطوقِ قبولیت) ہے جس کے ذریعے لڑکی کو فتح نہیں کیا جاتا بلکہ باہمی گلپوشی کے ذریعے دولہا دلہن ایک دوسرے کو قبول کرتے ہیں۔

رسمِ چترلمسی

دلہن کے گھر پر رسیوں کے ذریعے جو علامتی منڈپ تیار کیا جاتا ہے، اسے قبول کر کے احتراماً دولہا ان رسیوں کو ہاتھ سے چھوتا ہے۔ مراد یہ کہ جو چتر سازی کی گئی ہے وہ اسے بطور منڈپ قبول کرتا ہے۔ یہ رسم شادی کی رسم سے پہلے ادا کی جاتی ہے جسے عرفِ عام میں ''تنی چھونا'' کہا جاتا ہے۔

رسمِ رخصتی

یہ رسم اس زمانے میں شروع ہوئی تھی، جس زمانے میں ہندوستانی معاشرہ میں کم سنی میں شادی کا رواج عام تھا۔ شادی کے وقت بچوں کی عمر اتنی کم ہوتی تھی کہ انہیں ازدواج کے معنی تک

معلوم نہ ہوتے تھے۔ اُس زمانے میں شادی کے کئی ماہ (بعض علاقوں میں کئی سال) بعد لڑکی کو رخصت کیا جاتا تھا۔ اسے ''گونا'' یا ''مکلاوا'' کہا جاتا ہے۔ آج بھی بعض علاقوں میں شادی کے کئی ماہ بعد رخصتی ہوتی ہے لیکن عام طور پر اب شادی کے ساتھ ہی رسمِ رخصتی ادا کر دی جاتی ہے، یعنی بیاہ اور گونا ایک ساتھ ہو جاتا تھا۔

اس موقع پر گھر سے وداع ہو رہی لڑکی اپنے والدین اور دیگر رشتہ داروں سے گلے ملتی ہے، جو اسے رخصتی شگون دیتے ہیں۔ لڑکی کے بھائی اسے اٹھا کر ڈولی یا کار تک لے جاتے ہیں۔

رسمِ صدقۂ آب

ہندو معاشرے میں آفتابہ (کلش) کو ہمیشہ ہی بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ پانی سے بھرا ہوا آفتابہ خیر و برکت کی علامت مانا جاتا ہے۔ اس لیے دیوی دیوتاؤں کے ساتھ کلش کی پوجا بھی کی جاتی ہے۔ شادی کے بعد جب دولہا دلہن کو لے کر اپنے گھر پہنچتا ہے تو اس کی والدہ ان پر سے پانی کا صدقہ کرتی ہے۔ اسے ''پانی وارنا'' کہا جاتا ہے۔ ''وارنا'' کے معنی ہیں حفاظت۔ اس رسم کے ذریعے دولہا اور دلہن کے لیے ارواحِ بد سے تحفظ کی دعا کی جاتی ہے۔

رسمِ رونمائی

شادی کے بعد دلہن جب پہلی بار سسرال میں آتی ہے تو اسے دیکھنے کا اشتیاق تمام متعلقین کو ہوتا ہے۔ دلہن کی عزت افزائی کے لیے اس اشتیاق کو ایک رسم کے ذریعے پورا کیا جاتا ہے، جسے ''رونمائی'' یا ''منہ دکھائی'' کہا جاتا ہے۔ اس رسم کے پس منظر میں دو باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ اوّل یہ کہ نئی نویلی دلہن کو دیکھنے کا اشتیاق پورا ہو اور دوسرے یہ کہ معاشرہ اس کا خیر مقدم کرے۔ اس رسم کے وقت گھر کی عورتیں اور محلے والیاں نئی بہو کو گھیر کر بیٹھ جاتی ہیں اور باری باری سے اس کا گھونگھٹ اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھتی ہیں اور اسے شگون دیتی ہیں۔

رسمِ گُنڈیا

جس طرح بعض رسموں کے ذریعے سے دلہن کے گھر پر دولہے کا امتحان لیا جاتا ہے، اسی طرح اس رسم کے ذریعے دولہے کے گھر والے دلہن کا امتحان لیتے ہیں۔ اس سے انھیں دلہن کی نفسیات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ وہ کھیل کھیل ہی میں معلوم کر لیتے ہیں کہ نئی بہو کا مزاج کیسا ہے۔ اس رسم کو ''گُنڈیا'' یا ''گُنڈیے کھیلنا'' کہا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں یہ رسم مختلف صورتوں میں مروّج ہے۔ اس کی ایک عام صورت یہ ہے کہ دولہا اور دلہن کو رشتے کی عورتوں کے بیچ بٹھا کر ان کے سامنے ایک کھلا برتن رکھ دیا جاتا ہے۔ اس برتن میں ہلدی ملا پانی بھر دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے دلہن دولہا کا کنگن کھولتی ہے۔ کنگن کی گرہیں کھولنے میں اس کے صبر و استقلال کی آزمائش ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد چاندی کے روپے کو گھما کر تھالی میں پھینکا جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس روپے کو پہلے دولہا اٹھاتا ہے یا دلہن۔ اگر اس روپے کو تھالی میں گرتے ہی دلہن جھپٹ لے تو اسے چست، تیز طرار سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح دولہے کی بند مٹھی میں سے دلہن کو روپیہ نکالنا ہوتا ہے، جس سے اس کی جسمانی طاقت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے اور یہ معلوم بھی ہو جاتا ہے کہ وہ کس قدر شائستہ یا لحاظ مند ہے۔ بعض علاقوں میں روپے کے علاوہ دیگر کئی چیزیں بھی برتن میں پھینکی جاتی ہیں۔ ان میں سے دولہا دلہن اپنے اپنے حصے کی چیزوں پر قبضہ کرتے ہیں۔ ''گُنا'' کے ایک معنی ''حصہ'' بھی ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ دلہن اپنے حصے پر ٹوٹ پڑتی ہے یا شوہر کو اطمینان سے اس کا حصہ لینے دیتی ہے۔

رسمِ کنجد برنج

یہ رسم اس زمانے کی دین ہے جب ہندوستانی معاشرہ مشترکہ خاندانوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ نئی بہو کو اس کے سسرال کے لوگوں سے متعارف کرانے کے لیے اس رسم کو وضع کیا گیا۔ اس کے ذریعے نہ صرف نئی بہو کو افرادِ خانہ سے متعارف ہی کرایا جاتا ہے بلکہ اسے مشترکہ خاندان میں رچنے بسنے کی تلقین بھی کی جاتی ہے۔

دلہن کے پہلی بار سسرال آنے پر اس کے سامنے کنجد (تل) اور برنج (چاول) سے بھرا ہوا برتن رکھ دیا جاتا ہے۔ افرادِ کنبہ باری باری سے اس برتن میں سے تل چاولوں کی مٹھیاں بھر کر

دلہن کے ہاتھ میں دیتے ہیں اور وہ بھی اسی طرح ان کے ہاتھوں میں تل چاول دیتی ہے۔ گھر اور شریکے کی عورتیں گیتوں کے ذریعے سے یہ بتاتی رہتی ہیں کہ کون شخص رشتے میں اس کا کیا ہوتا ہے۔ عرفِ عام میں اسے "تِل چاولی" بھی کہا جاتا ہے۔

~~~~~
~~~~~

باب-۴

رسوماتِ مرگ

ہندوستانی معاشرے میں مروّج، موت سے متعلق رسومات ایسی ہیں جن کے ساتھ انسانی فکر کی ایک طویل تاریخ وابستہ ہے۔ اگر چہ ان رسوم کی ابتدا میں اس زمانے کی ضروریات کو دیکھا جاسکتا ہے جن کے پیشِ نظر ان کا اجرا عمل میں آیا تھا لیکن اگر ان پر ذرا غور کیا جائے تو ہم ان کے مطالعہ سے انسانی ذہن کے ارتقا کی مختلف منزلوں سے واقف ہوسکتے ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ زمانے میں ان میں سے اکثر رسومات بے معنی اور بے کار معلوم ہونے لگی ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارا معاشرہ ان سے منحرف نہیں ہوسکا ہے۔ سبب یہ کہ یہ رسمیں انسانی نفسیات پر اثر انداز ہوکر انسان کو موت کا صدمہ برداشت کرنے کی قوت عطا کرتی ہیں اور ذہنِ انسانی کو توازن اور تحمل سے ہمکنار کرتی ہیں۔ ذیل میں ہم ان رسوماتِ مرگ کا ذکر کریں گے جو ہندو سماج میں صدیوں صدیوں سے مروّج ہیں اور جن کے ذریعے ہندو سماج کسی کی موت کے دلدوز صدمے سے نکل کر اپنے قلب و ذہن کو معمول پر لاتا ہے۔

رسمِ آتشزدگی

ابتدائی انسان کے لیے موت ایک ایسا ہیبت ناک واقعہ تھی جس سے اس کی روح کانپ اٹھتی تھی۔ اسے یہ باور کرنا مشکل ہوتا تھا کہ کوئی چلتا پھرتا، ہنستا بولتا انسان دفعتاً ہمیشہ کے لیے خاموش اور بے حسی و حرکت بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن مردے کو گھر میں سنبھال کر رکھنے سے بھی وہ معذور تھا چوں کہ چند روز ہی میں لاش بدبو دینے لگتی تھی۔ مجبوراً اس نے مردے کو کھلے میدان

میں رکھنا شروع کر دیا جہاں جنگلی جانور اور پرندے اسے کھا جاتے تھے۔ یہ منظر بھی ابتدائی انسان کے لیے بڑا ہیبت ناک ثابت ہوا چوں کہ مرنے والا بھی اسے بہت عزیز رہا ہوتا تھا۔ اپنے کسی عزیز کی لاش پر غول در غول ٹوٹ کر پڑتے ہوئے پرندے اس کے لیے ایک ایسا منظر پیش کرتے تھے جو اس کی روح کو بے چین کر دیتا تھا۔ تب اس نے مردے کو پانی میں بہانا شروع کر دیا۔ یہ طریقۂ کار بہتر تو تھا لیکن ابتدائی انسان کے لیے مردے کو ڈھو کر دریا یا سمندر تک لے جانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لہٰذا اس نے مردے کو دفنانا شروع کر دیا۔ پھر جب معاشرے کی تشکیل عمل میں آئی اور انسان کو تہذیب کی روشنی نصیب ہونا شروع ہوئی تو دفن کرنے کا دستور بھی ختم ہو گیا اور مردے کو سپردِ آتش کیا جانے لگا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اسکے اندر کا یہ احساس جاتا ہی نہیں تھا کہ مرنے والا وہ سامنے زیرِ زمین پڑا ہوا ہے۔ وفورِ جذبات سے بے قابو ہو کر وہ اکثر زمین کو کھود کر اس کی لاش کو باہر نکال لیتا تھا۔ سپردِ آتش کرنے کے بعد چوں کہ مرنے والا اس کی دسترس سے دور چلا جاتا تھا، اس لیے آتشزدگی مقبولِ عام ہونے لگی۔ اسے ''داہ سنسکار'' کہا گیا۔

مردے کو چتا میں رکھ کر سپردِ آتش کرنے کی اس رسم کے اجرا میں دو اسباب کارفرما تھے۔ اوّل یہ کہ نذرِ آتش ہوا جسمِ خاکی مکمل طور پر خاک میں تبدیل ہو جاتا تھا اور پسماندگان کے دل میں لاش کے تحفظ کی حسرت بھی دم توڑ دیتی تھی۔ دوسرے یہ کہ ویدوں کے زمانے میں آدم خاکی اور دیوتاؤں کے درمیان آگ ہی واحد ذریعہ ترسیل ہوتی تھی۔ آگ کے ذریعے ہی قدیم آریہ لوگ متعدد اشیاء فرشتوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ لہٰذا مردے کو پرلوک (عالمِ عقبیٰ) پتر لوک (عالمِ ارواح) یا برہملوک (عالمِ لاہوت) پہنچانے کے لیے اس کا سپردِ آتش کیا جانا ہی ایک فطری عمل تھا۔

رفتہ رفتہ سماجی ضروریات کے باعث بہت سی دوسری رسمیں بھی اس رسم کے ساتھ وابستہ ہو گئیں۔ کسی زمانے میں مردے کے ساتھ ایک گائے بھی جلائی جاتی تھی چوں کہ ایک سماجی اعتقاد یہ تھا کہ ''یم لوک'' کے راستے میں پڑنے والی ''ویترنی'' نامی ندی کو مرنے والے کی روح صرف گائے کی مدد ہی سے پار کر سکتی ہے۔ ازاں بعد اس رسم نے ''گئو دان'' کی صورت اختیار کر لی۔ اسے ''بلی'' (قربانی) کہا جاتا تھا۔ اس میں کسی گائے سے تین بار مردے کی چتا کا پھیرا لگوا کر گائے کو کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ 'بلی' کی گائے کو گھر پر باندھنا معیوب تصور کیا جاتا تھا اور اس کا دودھ کوئی نہیں پیتا تھا۔ آگے چل کر اس رسم میں مزید تبدیلی آئی اور اس موقع پر براہمنوں نے گئو دان قبول کرنا شروع کر دیا۔ دان میں حاصل ہوئیں گئویں براہمنوں کے

گھروں میں بندھنے لگیں۔ ہوتے ہوتے یہ رسم یہاں تک آ پہنچی کہ براہمن نقدی کو گائے کی علامت مان کر گئو دان کرانے لگے۔

عہدِ قدیم میں شوہر کی موت ہونے پر اس کی بیوی چِتا پر چڑھ کر مردے کے ساتھ لیٹ جاتی تھی اور سماج اسے سمجھا بجھا کر چِتا پر سے اتارتا تھا۔ راجپوت عہد میں اس رسم نے ''جوہر'' کا روپ اختیار کر لیا اور بیوہ شوہر کے ساتھ زندہ جلنے لگی۔ دورِ حاضر میں اگرچہ ایسی متعدد رسمیں مفقود ہو چکی ہیں لیکن مروّج رسومات میں ان کے عناصر موجود ہیں، جن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

ہندو سماج میں جب کسی کی موت ہونے لگتی ہے تو اسے چارپائی پر سے اتار کر زمین پر لٹا دیا جاتا ہے تاکہ چارپائی کا جھول اس کی آخری سانسوں میں مانع نہ ہو۔ اس کے دم توڑنے کے بعد سب سے پہلے اسے غسل دیا جاتا ہے۔ پھر اسے ارتھی (جنازہ) پر رکھ کر رسیّوں سے باندھا جاتا ہے تاکہ اپنے آخری سفر میں وہ ارتھی پر سے پھسل نہ جائے۔ شمشان کا آدھا راستہ طے کر کے اس کے پاؤں بستی کی طرف کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ زندہ لوگوں کے ساتھ اس کا رشتہ ختم ہوا۔ شمشان پہنچ کر مردے کو ارتھی پر سے اتار کر چِتا میں رکھا جاتا ہے۔ عام طور پر سب سے بڑا بیٹا ہی چِتا کو آگ دیتا ہے۔ جب چِتا جل اٹھتی ہے تو بڑا بیٹا ہی، ارتھی کے ایک ڈنڈے سے مردے کی کھوپڑی توڑتا ہے جسے ''کپال کریا'' کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد مردے کے جسم میں موجود ہوا کے اخراج کے لیے راستہ بنانا ہے تاکہ لاش مکمل طور پر جل جائے۔

اس رسم کی مندرجہ بالا تفصیل کے ہر گوشے کے لیے اگرچہ مذہبی، تمدنی اور ثقافتی تفسیریں موجود ہیں لیکن ان میں سے کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جسے بے معنی یا بے کار کہہ کر مسترد کیا جا سکے یا جسے معاشرے کے تعلق سے غیر ضروری قرار دیا جا سکے۔ ''کپال کریا'' کے بعد جنازے میں شریک ہوئے لوگ آس پاس سے گھاس کا تنکا لے کر توڑتے ہیں۔ یہ بھی ایک علامت ہے کہ مرنے والے کے ساتھ اب پسماندگان کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ مردے کو شمشان لے جانا ''مجل'' کہلاتا ہے، جو لفظِ ''منزل'' کا بدلا ہوا روپ ہے کہ زندہ لوگ مردے کو اس کی آخری منزل تک پہنچا آئے ہیں۔

رسمِ آتش زدگی کی تمام رِیتیں اور فریضے اگرچہ براہمن اور آچارج کی مدد سے سرانجام پاتے ہیں لیکن حقیقت میں اس رسم کا بنیادی مقصد صحیح اور باعزت طریقے سے مردے کی مٹی ٹھکانے لگانا

ہے۔ مذہبی اعتبار سے ان تمام ریتوں کا مقصد مرنے والے کی روح کو بہ حفاظت عالمِ غیب تک پہنچانا ہے، جسے ''کرم کانڈ'' کہا جاتا ہے۔ اس کرم کانڈ کی ضرورت اور اہمیت بحث طلب ہے۔ ایسا معلوم پڑتا ہے کہ براہمنوں نے ہندو معاشرے میں اپنی برتری قائم کرنے کے خیال سے کرم کانڈ کو رسمِ آتش زدگی کا لازمی جزو قرار دے دیا تھا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کسی کی موت ہی اس وقت واقع ہوتی ہے جب اس کی روح اس کے جسمِ خاکی سے پرواز کر جاتی ہے۔ روح کی نجات کے لیے جسمِ خاکی کو ذریعہ بنانے پر اعتراض کی گنجائش بہر حال باقی رہتی ہے۔

ہندو معاشرہ بعض مواقع پر رسمِ آتش زدگی سے انحراف بھی کرتا ہے۔ چھوٹی عمر میں داعئ اجل کو لبیک کہنے والے بچّوں کو سپردِ آتش نہ کرکے، دفن کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حاملہ عورتوں، سادھو سنیاسیوں اور چھوت کی بیماری سے مرے ہوئے لوگوں کو بھی دفنایا ہی جاتا ہے، نذرِ آتش نہیں کیا جاتا۔

رسمِ عظم اندوختی

کوئی بھی معاشرہ جب اجتماعی طور پر کسی مروجہ رسم سے کنارا کشی کرتا ہے اور اس کی جگہ پر کسی نئی رسم سے وابستہ ہوتا ہے، تب اس نئی رسم میں متروکہ رسم کے عناصر موجود رہتے ہیں۔ قدیم آریوں نے جب مردے کو دفنانے اور پانی میں بہانے کی رسمیں ترک کرکے رسمِ آتش زدگی ایجاد کی تو اس نئی رسم کے ساتھ متذکرہ دونوں متروک رسموں کے عناصر علامتی طور پر منسلک ہوگئے۔ آتش زدگی کے بعد مردے کے عظام کو گھڑے میں ڈال کر دفنایا جانے لگا۔ آگے چل کر عظام کو دفنانے کا رواج ختم ہوگیا اور انھیں دفنانے کے بجائے پانی میں بہایا جانے لگا۔ تدفین کا عمل اس صورت میں باقی رہ گیا کہ چِتا کی راکھ کو گھڑے میں بھر کر دفنایا جانے لگا۔

پرانے زمانے میں عظم اندوختی کی رسم کہیں موت کے تیسرے روز، کہیں ساتویں کہیں تیرہویں اور کہیں سترہویں روز ادا کی جاتی تھی لیکن موجودہ وقتوں میں اسے عام طور پر موت کے چوتھے روز ادا کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس رسم کو ''چوتھا'' کہا جانے لگا ہے۔ چوں کہ اس رسم میں مردے کی جلی ہوئی ہڈیوں کو چتا کی راکھ میں سے چُنا جاتا ہے اس لیے اسے ''استھی سنچے'' اور ''پھول چُنتا'' بھی کہتے ہیں۔

رسم عظم اندوختی میں سب سے پہلے چتا کی راکھ کو دودھ ملے پانی کا چھینٹا دیا جاتا ہے تاکہ راکھ اگر کہیں پر گرم ہو تو اسے ٹھنڈا کیا جا سکے۔ اسکے بعد احترام اور احتیاط کے ساتھ عظام کو چنا جاتا ہے۔ چتا کی راکھ کو لکڑی کے چھوٹے چھوٹے پھاوڑوں کے ذریعے اکٹھا کر دیا جاتا ہے اور اس کے گرد دھاگا باندھ دیا جاتا ہے۔ چنی ہوئی ہڈیوں کو دھو کر ایک تھیلی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ تھیلی شمشان اور بستی کے بیچ کسی درخت پر ٹانگ دی جاتی ہے۔ جس روز کسی کو یہ پھول نذرِ آب کرنے کے لیے لے جانا ہوتے ہیں، وہ تھیلی کو درخت پر سے اتار کر لے جاتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اندوختہ عظام کو مختلف دریاؤں میں بہانے کا رواج ہے لیکن عوام میں ان کا گنگا میں بہایا جانا مقبول ہے۔ عظام کے نذرِ آب کیے جانے میں عہدِ قدیم کی ''جل نکھات'' نامی اس رسم کے عناصر کو دیکھا جا سکتا ہے جس کے تحت مردے کو پانی میں بہایا جاتا ہے۔

عظم اندوختی کی اس رسم میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ اوّل یہ کہ اس سے متوفی کی موجودگی کا نفسیاتی احساس مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ متوفی کے تئیں پسماندگان کا جذبۂ محبت یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس کے عظام سوختہ کو بھی ادب اور احترام کے ساتھ ٹھکانے لگایا جائے۔ ان عظام کو نذرِ آب کرنے کے لیے کسی مقدس مقام پر لے جانے میں بھی ایک نفسیاتی پہلو موجود ہے۔ عام طور پر ''جل نکھات'' کی رسم سب سے بڑا بیٹا ہی ادا کرتا ہے۔ گھر کے ماتمی ماحول سے نکل کر کسی مقدس مقام کی زیارت، خاص طور پر ذہنی انتشار کے عالم میں، اس کے لیے باعثِ سکون ثابت ہوتی ہے اور وہ اپنے غم کو برداشت کرنے کی مزید قوت حاصل کرتا ہے۔

رسمِ آتش زدگی کی طرح ہی رسمِ عظم اندوختی میں بھی متعدد مقامی ریتیں داخل ہو چکی ہیں۔ یہ رسم بھی براہمن اور آچارج کے ذریعے ہی ادا کیے جانے کا رواج ہے۔ اس کے لیے ضروری سامان آچارج ہی لاتا ہے۔ عظم اندوختی میں ''پنڈ دان'' (تجسیم روح) اور ''استھی پوجن'' (عظم پرستی) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عظم اندوختی کے دوران عظم القص کو بڑے احتیاط اور اشتیاق کے ساتھ تلاش کیا جاتا ہے۔ اسے ''پتلی'' یا ''آتمارام'' کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی ہڈی ہے جس پر متوفی کی شکل کا شائبہ ہوتا ہے۔ باقی ہڈیوں کی نسبت اس ہڈی کا نذرِ آب کیا جانا انتہائی ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی ہمارا معاشرہ، غیر شعوری طور پر، مرنے والے کی شناخت کے ہر نقطے کو مٹانے کا خواہش مند دکھائی دیتا ہے۔ انسانی نفسیات کے تعلق سے یہ ضروری بھی ہے اور فطری بھی۔

عظام کو نذرِ آب کرنے میں بھی براہمن اور آچارج کی مدد لینا ہمارے معاشرے کا چلن ہے۔ آچارج کی موجودگی میں عظام کو تھیلی میں سے نکال کر دھویا جاتا ہے۔ پھر دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر انھیں احترام کے ساتھ پانی میں بہایا جاتا ہے۔ اس کے بعد کوئی براہمن پنڈ دان کراتا ہے اور اختتامِ رسم پر براہمنوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

رسمِ قُل

جن لوگوں نے کبھی کسی کو مرتے ہوئے دیکھا ہے، انھیں اس کا تجربہ ہوگا کہ موت کے کئی دن بعد تک، مرنے والا اس طرح ان کے دل و دماغ پر حاوی رہتا ہے جیسے وہ مرا نہ ہو اور ایک سایہ بن کر ان کی شخصیت کا حصہ بن گیا ہو۔ ان دنوں میں کئی بار انھیں مردے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کئی بار ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو۔ کئی بار ایسا لگتا ہے جیسے وہ آس پاس چل پھر رہا ہو۔ یہی وہ نفسیاتی الجھن تھی جس نے ابتدائی انسان کو کوئی ایسی ترکیب سوچنے پر مجبور کیا تھا جس کے ذریعے وہ اپنے قلبی اضمحال، ذہنی انتشار اور احساسِ خوف و حراس پر قابو پاسکے۔ اس کے لیے مردے کے زندہ ہونے کے ہر احساس کا مٹایا جانا لازمی تصور کیا گیا۔

ویدوں کے عہد میں آریوں نے ابتدائی انسانی کے تلاش کردہ طریقۂ کار کو ایک فلسفہ کے طور پر ترتیب دے کر اس طرح پیش کیا کہ مرنے والا، جسم کی موت کے باوجود، تب تک نہیں مرتا جب تک اس کی روح کو نجات نہ مل جائے۔ روح کی نجات کو ''گتی'' کہا گیا۔ مردے کی آتما کی گتی کے لیے یہ ضروری خیال کیا گیا کہ روح کو خاطر خواہ زادِ راہ دے کر عالمِ ارواح کے سفر پر روانہ کیا جائے۔ متذکرہ ذہنی حالت سے نکل کر معمول پر آنے کے لیے درکار زیادہ سے زیادہ وقت کی گنجائش کا لحاظ رکھ کر یہ فرض کیا گیا کہ غیر مادی روح کو عالمِ ارواح تک پہنچنے میں کم از کم گیارہ دن اور زیادہ سے زیادہ تیس دن درکار ہوتے ہیں۔

متوفی کی غیر مادی روح کو سفر کی صعوبتوں سے بچا کر عالمِ ارواح تک پہنچانے کے جذبے میں اس کے لیے ہمارا جذبۂ محبت اور جذبۂ احترام شامل ہے۔ اس جذبے سے گتی کے منطق کو اور بھی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مادی روح کی تجسیم کا تصور مسلم ہو گیا۔ دس دن تک ''پنڈ دان'' کے ذریعے روح کے لیے خوراک بھیجنے کا انتظام کیا جانے لگا۔ اصل مقصد

تو یہ تھا کہ دس روز مذہبی رسوم کی ادائیگی میں مصروف رہ کر پسماندگان اپنے غم کو بھلانے کی کوشش کریں لیکن ضعیف الاعتقادی کے باعث یہ رسوم ''کرم کانڈ'' بن گئیں اور ان کا اصل مقصد فوت ہو گیا۔

پرانے زمانے میں تو یہ ہوتا تھا کہ دس کے دس دن کسی نہ کسی مذہبی رسم کی ادائیگی میں گذر جاتے تھے اور پسماندگان اس طویل عرصے میں اپنے ذہن کو اعتدال پر لانے میں کامیاب ہو جاتے تھے لیکن موجودہ وقتوں میں ان دس دنوں کی رسومات کو، کسی نہ کسی صورت میں، گیارہویں دن ہی ادا کر دیا جاتا ہے۔ اسی کو رسمِ قُل یا ''کریا کرم'' کہا جاتا ہے۔ قدیم آریوں نے دس روزہ رسومات کے علاوہ بعض ایسے طریقے بھی وضع کیے تھے جن کے ذریعے موت کے باعث پیدا ہوئی گھر کی ناپاکی کو بھی دور کیا جاتا تھا۔ فی زمانہ اسے بھی رسمِ قل کی ایک اختتامی ریت بنا کر شانتی کرم کا نام دے دیا گیا ہے۔

رسمِ قل میں غیر مادّی روح کی تجسیم کی جاتی ہے۔ اسے ''پنڈ دان'' کہا جاتا ہے۔ پنڈ کے معنی ہیں جسم اور دان کے معنی ہیں دنیا۔ موت کے دن سے لے کر دس روز تک روحِ متوفی کے لیے جو کھانا بھیجا جاتا ہے، اس کا آبی ہونا لازمی ہے۔ اس لیے عام طور پر پنڈ دان کے لیے چاولوں کا استعمال ہوتا ہے۔ پکے ہوئے چاولوں کو کسی غنچہ میں ڈال کر مسل لیا جاتا ہے اور اس کے پیڑے بنا لیے جاتے ہیں۔ یہ پیڑے مردوں کی روحوں کی علامت ہوتے ہیں۔ ان کا دان ہی پنڈ دان کہلاتا ہے۔ رسمِ قل میں مرنے والے کے علاوہ پہلے مر چکے بزرگوں کے پنڈ بھی بنائے جاتے ہیں۔ پوجا کے بعد مردے کے پنڈ کو توڑ کر دوسرے پنڈوں میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ اب متوفی کی روح عالمِ ارواح میں داخل ہو کر خاندان کے بزرگ مرحومین کی روحوں میں شامل ہو گئی ہے اور مرنے والا بھی اب ایک پُرکھا بن گیا ہے۔

پرکھا بنتے ہی اس کی حیثیت دوسرے اجداد جیسی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کے لیے کی جارہی ''اگنی کریا'' (آتشی عمل) بند ہو جاتی ہے۔ اب اسے غیر آبی چیزیں بھی کھانے کو دی جا سکتی ہیں۔ اسے ''شرادھ'' (ختم دلانا) کہتے ہیں۔ شرادھ میں چاول کے علاوہ دوسرے اناج بھی شامل ہوتے ہیں۔ شرادھ کے ذریعے روح کو مطمئن کیا جاتا ہے جسے ''ترپن'' کہتے ہیں۔ شرادھ کے بعد دیوتاؤں کی پوجا کر کے گھر کی ناپاکی کو دور کیا جاتا ہے، جسے ''شانتی کرم'' کہتے ہیں۔

ہندو معاشرے میں ذاتوں کی وجہ سے مختلف ذاتوں میں رسمِ قل کے لیے مختلف دن متعین کیے

گئے ہیں۔ براہمن کی رسمِ قل موت کے گیارہویں دن، کشتری کی تیرہویں اور ویش کی سترہویں دن ادا کی جاتی ہے۔

رسمِ دستار بندی

جس روز رسمِ قل ادا کی جاتی ہے، اسی روز یا اس سے اگلے روز رسمِ دستار بندی یا رسم پگڑی ہوتی ہے۔ اس رسم کی حیثیت بھی علامتی ہے۔ قدیم ہندوستانی کتب اور بت سازی کے قدیم نمونے شاہد ہیں کہ ہندوستان میں انتہائی قدیم زمانے سے پگڑی پہننے کا رواج چلا آرہا ہے۔ اس کے پس منظر میں ہندوستان کی جغرافیائی حالت کارفرما نظر آتی ہے۔ شدید گرمی اور شدید سردی کے اس ملک میں سر کو اچھی طرح ڈھانپ کر رکھنا قدرتی طور پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعد کے زمانے میں دستار کی جگہ ٹوپی پہنی جانے لگی لیکن ہندوستان کا عام آدمی ننگے سر نہیں رہتا تھا۔ اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ پہلی دوسری صدی عیسوی میں ہندوستانی عوام ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی آمد سے اگرچہ ٹوپی پہننے کا رواج ختم نہیں ہوا لیکن پگڑی پہننے کا رواج پھر سے عام ہوگیا۔ ہیون سانگ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانے میں ہندوستان میں ٹوپی پہننے کا رواج تھا۔ عام حالات میں یہاں کے لوگ ٹوپی پہنتے رہے ہوں یا پگڑی، میرا خیال ہے کہ رسمِ دستار بندی میں ٹوپی کبھی داخل نہیں ہوئی۔ وجہ یہ کہ ٹوپی کپڑے کو سی کر بنائی جاتی ہے جب کہ موت سے متعلق تمام رسومات کی ادائیگی بغیر سِلا کپڑا پہن کر ہی کی جاتی ہے۔ سِلا ہوا کپڑا ان رسوم کے اختتام پر ہی پہنا جاسکتا ہے۔ اس لیے شاید کسی زمانے میں بھی رسمِ دستار بندی میں ٹوپی دستار کی جگہ نہیں لے سکی ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں زمانۂ قدیم ہی سے پگڑی کو ذمہ داری کی علامت مانا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں جب کوئی راجہ، اپنی حیات میں ہی، اپنے ولی عہد کو تخت نشین کرتا تھا تو وہ اپنے سر سے دستار اتار کر ولی عہد کے سر پر رکھ دیتا تھا اور برہنہ سر اس کے سامنے بیٹھ کر کہتا تھا۔ ''آج سے تم راجہ ہو اور میں تمھاری پرجا ہوں۔'' ذمہ داری کی علامت کے طور پر ہی پگڑی کا چلن رسم دستار بندی کی شکل میں مرگ کی ایک اہم رسم بن گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کے مقامی رواج اس رسم کو متاثر کرتے رہے اور فی زمانہ مختلف علاقوں میں اس رسم کی مختلف صورتیں دستیاب ہوتی ہیں۔ باوجود اس اختلاف کے اس رسم کا بنیادی مقصد ہر علاقے

میں ذمہ داری کا ایک شخص سے دوسرے شخص کو منتقل ہونا ہی ہے۔

باپ کی موت کے بعد بیٹے کے سر پر پگڑی رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مادری اور پدری رشتہ دار، برادری، شریکہ اور سماج یہ تسلیم کرے کہ اب بیٹا ہی اس گھر کا مکھیا ہے۔ مذہبی طریقے سے اس رسم کو اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ عام طور پر ننہال کی طرف سے پیش کی گئی پگڑی کو متعلقین کی موجودگی میں کسی براہمن کے سپرد کیا جاتا ہے جو نو سیاروں (نوگرہ) اور دس محافظینِ سمات (دش لوک پالک) کی پوجا کر کے پگڑی کو زعفران (کیسر) لگاتا ہے۔ زعفران محبت (انوراگ) کی علامت ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس دستار کو پہننے کے بعد خاندان اور معاشرے سے محبت کرنا اس کا فرضِ اوّلین ہوگا۔ زعفران ہی سے پگڑی کے ایک کنارے پر ''سواستک'' (نشانِ بہبود) بنایا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ اس دستار کو پہننے والا یہ قبول کرتا ہے کہ وہ خاندان اور معاشرے کی فلاح و بہبود سے متعلق اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

پوجا کے بعد تمام حاضرین سیدھے ہاتھ سے دستار کو چھو کر اپنی رضامندی اور منظوری کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے بعد خاندان کا پروہت دستار کو لڑکے کے سر پر رکھ دیتا ہے۔ اس موقع پر شگون سلامی دینے کی عوامی رسم بھی مروّج ہے۔ رسمِ دستار بندی کے بعد لڑکا بازار جاتا ہے اور مٹھائی وغیرہ خرید کر گھر لوٹتا ہے۔ یہ علامت اس بات کی ہے کہ اب ماتمی ماحول ختم ہوا اور گھر کی زندگی پھر سے معمول پر آ گئی ہے۔

رسمِ ختم

رسمِ ختم رسوماتِ مرگ کی آخری رسم ہے۔ عوام میں اس رسم کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ جن علاقوں میں یہ رسم موت کے بارہویں دن ہوتی ہے، وہاں اسے ''بارہا'' کہا جاتا ہے۔ جہاں یہ رسم سولہویں دن ہوتی ہے وہاں اسے ''سولہا'' کہا جاتا ہے اور جہاں پر اس کے سترہویں دن ادا کیے جانے کا رواج ہے، وہاں اسے ''سترہویں'' کہا جاتا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مرگ سے متعلق رسومات میں دو باتیں بہت اہم رہی ہیں۔ اوّل یہ کہ ان رسومات کے ذریعے پسماندگان خود اپنے ہاتھوں متوفی کی روح کو عالمِ غیب تک پہنچانے کا نفسیاتی اطمینان حاصل کرتے ہیں اور اس طرح موت کے باعث پیدا ہوئے ذہنی انتشار اور

قلبی اضمحلال سے نجات حاصل کرتے ہیں۔ دوم یہ کہ ان رسومات کے ذریعے وہ مرنے والے کی روح کو عزت اور احترام کے ساتھ عالمِ ارواح میں مقیم کر کے اس کی نجات (گتی) کو یقینی بناتے ہیں۔ اسی غرض سے پسماندگان موت کے دن سے لے کر اگلے دس دن تک ''پنڈ دان'' کے ذریعے متوفی کی روح کے لیے صبح و شام کے کھانے کا اہتمام کرتے ہیں اور مغرب کے وقت ''دیپ دان'' کے ذریعے اس کے لیے روشنی کا انتظام کرتے ہیں۔ غیر مادی روح گیارہویں دن عالمِ ارواح میں داخل ہوتی ہے۔ اب تک اس کی تجسیم ہو چکی ہوتی ہے اور اسے روحانی جسم حاصل ہو چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا اب صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ عالمِ ارواح میں اس کے قیام کا انتظام کر کے اسے وہاں سکونت پذیر کیا جائے۔ اس فریضے کو سرانجام دینے کے لیے ''رسمِ ختم'' وضع کی گئی تھی۔

رسمِ قل کی طرح ہی رسمِ ختم بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے ادا کی جاتی ہے، لیکن کسی بھی علاقے میں اس کی بنیادی حیثیت کو تبدیل نہیں کیا گیا ہے۔ اکثر علاقوں میں اس رسم کے ذریعے متوفی کی روح کو سال بھر کا ضروری سامان دیا جاتا ہے۔ اس کے آرام کے لیے چارپائی، بستر، اس کے کھانے پینے کے لیے برتن بھانڈے، پہننے کے لیے کپڑے، پیروں کے لیے چپل جوتا، سر کے لیے پگڑی ٹوپی، بارش سے بچنے کے لیے چھاتا، سال بھر کے استعمال کے لیے ۳۶۵ داتون، ۳۶۵ جنیو وغیرہ خیرات میں دیئے جاتے ہیں۔ متعدد علاقوں میں کپڑا بستر تو کل پروہت کو دیا جاتا ہے اور مردے کی سال بھر کی خوراک کے طور پر ۳۶۵ لڈو براہمنوں کو کھلائے جاتے ہیں۔ اسے خیراتِ یقینی (نیتی دان) کہا جاتا ہے۔

شمالی ہندوستان میں اس رسم کی مروّجہ صورت یہ ہے کہ امن و امان کے عمل (شانتی کرم) کے بعد دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی ہے اور کپڑا بستر وغیرہ کل پروہت کو دے دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر پروہت کے علاوہ آٹھ براہمنوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ یہ آٹھ براہمن آٹھ سمتوں کے محافظین کی علامت ہوتے ہیں۔ ان میں پروہت کا مقام برہما کا ہوتا ہے۔ مقصد یہ کہ مرنے والے کی روح کو آٹھوں سمتوں سے اطمینان اور شادمانی نصیب ہو۔ اس کے بعد نیتی دان کے ذریعے لڈو تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اگر مرنے والا اپنی عمر بھوگ کر قدرتی موت سے مرا ہوتا ہے تو اس رسم میں برادری بھائی چارے کی روٹی اور بہو بیٹیوں کے شگون بھی شامل ہوتے ہیں۔

اس رسم کے ذریعے یہ یقین کر کے کہ مرنے والے کی روح عالمِ ارواح میں مقیم ہو چکی ہے اور اسے سال بھر کا ضروری سامان بہم پہنچا دیا گیا ہے، پسماندگان نہ صرف مردے کی موجودگی کے

نفسیاتی اوہام ہی سے چھٹکارا پاتے ہیں بلکہ اس بہانے سے دان پُن کر کے اپنی عاقبت بھی سنوارتے ہیں۔ ہندوستانی معاشرے میں ''دان'' کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اس لیے اس رسم میں دان کی بھر پور گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مرگ سے متعلق رسومات اختتام پذیر ہو جاتی ہیں۔ اب سال کے سال، مرنے والے کو ''شرادھ'' کے ذریعے یاد کرنا اور اسے خراجِ عقیدت پیش کرنا باقی رہ جاتا ہے جو نسل در نسل جاری رہتا ہے۔ شرادھ کے لیے ایک پکھواڑہ متعین ہے۔ دیسی مہینے کی جس تاریخ کو کسی کا انتقال ہوا ہوتا ہے، شرادھ کے پکھواڑے میں اسی تاریخ کو اس کے نام پر طعام کی خیرات کی جاتی ہے۔

رسمِ قل کا اختتامی حصہ عملِ امن و امان (شانتی کرم) پر مشتمل ہے۔ اس عمل کے ذریعے گھر کے ماتمی ماحول کو ختم کر کے اہلِ خانہ کو پھر سے انکی سماجی ذمہ داریوں کی طرف راغب کیا جاتا ہے۔ ماتم کی وجہ سے یہ ذمہ داریاں اتنے دن تک التوا میں پڑی ہوتی ہیں کہ جیسے پسماندگان کی زندگی ایک نقطے پر آ کر ٹھہر گئی ہو۔ شانتی کرم زندگی کو پھر سے معمول پر لاتا ہے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں، ماتم کے طور پر، لوگ موت کے دن اپنی ٹوپیاں الٹی کر لیتے ہیں۔ رسمِ ختم کے ساتھ یہ ٹوپیاں بھی سیدھی کر لی جاتی ہیں۔

عوامی رسومات

مذہبی احکام کے مطابق معینہ طریقوں سے رسومات کو ادا کرتا ہوا کوئی معاشرہ جب ان کے اصل مقصد سے بے خبر، صرف روایت کے طور پر ہی ان کو ادا کرتا رہتا ہے تو طرح طرح کے اوہام، عقیدے اور خیالات بھی ان رسموں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مذہبی کتابوں نے مرنے والے کی روح کے لیے از سر نو زندگی کا جو تصور پیش کیا ہے اس کا اصل مقصد پسماندگان کو نفسیاتی طور پر یہ یقین دلانا ہے کہ مرنے والا موت کے بعد ان کی دسترس سے دور چلا جاتا ہے اور اس صورت میں سوائے صبر کے اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ پسماندگان کو اس کا یقین جبھی ہوتا ہے جب وہ اپنے ہاتھوں اس کی روح کو عالمِ ارواح میں مقیم کرتے ہیں۔ اپنے اس احساس کو تقویت دینے کی غرض سے معینہ رسومات کے ساتھ ساتھ متعدد عوامی رسومات بھی رائج ہو گئیں۔ ان میں سے اکثر رسومات کا وجود سماجی ضرورتوں کا رہینِ منت ہے۔ یہ تمام رسومات علامتی ہیں۔ اور ہر علامت کے پس منظر میں موت کی مسلمہ حقیقت کو تسلیم کر کے

مرنے والے کے غم کو بھلانے کی کسی نہ کسی ترکیب کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں مروج موت سے متعلق عوامی رسومات مندرجہ ذیل ہیں۔

رسمِ خُم شکستگی

ہندو معاشرے میں جب کسی مردے کو شمشان لے جایا جاتا ہے تو اس کے جنازے کے ساتھ پانی سے بھرا ہوا ایک گھڑا بھی رہتا ہے۔ معرفت کی زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ متوفی جب تک زندہ تھا تب تک وہ آتشی عنصر (اگنی تتو) تھا مگر اب جبکہ اس کا جسم سپردِ آتش کردیا جائے گا، تو وہ آبی عنصر (جل تتو) میں تبدیل ہوجائے گا۔ سماجی علامت کے طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ پسماندگان یہ باور کریں کہ جب تک روح جسم کے اندر موجود ہوتی ہے تب تک انسان بھرے ہوئے گھڑے کی طرح ہوتا ہے لیکن جب روح جسم سے پرواز کرجاتی ہے تو جسم خالی گھڑے جیسا ہوجاتا ہے۔

مردے کو چِتا پر رکھ کر اس گھڑے کو زمین پر دے مارتے ہیں اور گھڑا چور چور ہوجاتا ہے۔ یہ علامت بھی مرنے والے کی زندگی کے اختتام کے اعلان کی علامت ہے۔ اس رسم کو ''کُنبھ بھنجن'' یا ''گھڑا توڑنا'' کہا جاتا ہے۔

رسمِ خم آویزی

رسمِ آتش زدگی کے بعد پانی سے بھرا ہوا ایک گھڑا پیپل سے لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس گھڑے کے پیندے میں سوراخ کرکے کوئی کپڑا یا رسّی ڈال دی جاتی ہے جس کے ذریعے گھڑے کا پانی ہر وقت بوند بوند ٹپکتا رہتا ہے۔ معرفت کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ ارواح کے سفر پر گامزن روح کو پانی بہم پہنچایا جائے۔ تجسیم (پنڈ دان) کے ذریعے روحِ متوفی کو صبح شام کھانا دیا جاتا ہے چوں کہ کھانا عام طور پر دن میں دو بار ہی کھایا جاتا ہے مگر پانی کی پیاس تو دن رات، کسی وقت بھی محسوس ہوسکتی ہے، بالخصوص اس حالت میں جبکہ سفر جاری ہو۔ سماجی اعتبار سے اس رسم کے ذریعے موت کا اعلان کیا جاتا ہے۔ گاؤں یا محلّے میں آنے والا کوئی بھی

شخص پیپل سے لٹکتے ہوئے گھڑے کو دیکھ کر یہ جان لیتا ہے کہ اس محلّے یا اس گاؤں میں کسی کی موت واقع ہو چکی ہے۔

مذہبی اعتبار سے اس کے معنی ہیں سقایتِ شجر جسے ''برکش ترپن'' کہا جاتا ہے۔ غور طلب یہ ہے کہ خم آویزی کے لیے پیپل ہی کا انتخاب کیوں کیا گیا۔ ہندو سماج میں جو اہمیت پیپل کے درخت کو حاصل ہے، وہ شاید کسی دوسرے درخت کو حاصل نہیں ہے۔ پیپل کی تعظیم کا سبب اس درخت کے وہ اوصاف ہیں جن کی بدولت قدیم ہندو معاشرہ متعدد امراض سے محفوظ رہتا تھا۔ گاؤں یا محلّے میں پیپل کا ہونا کسی وید یا حکیم کے ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

حیضی امراض، جوڑوں کا درد، معدے کی سوزش، کمر کا درد جیسی کتنی ہی ایسی بیماریاں ہیں جن کا علاج پیپل سے ہوتا ہے۔ پھوڑے پھنسیوں کے علاج کے لیے پیپل کی چھال کا لیپ انتہائی مفید ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ علمائے دین نے پیپل کی حفاظت کے خیال سے اس کے ترپن (سقایت) کو ضروری قرار دے دیا۔ کسی کی موت پر جب اس کی روح کے لیے پانی بہم پہنچانے کا سوال پیدا ہوا تو خم آویزی کے لیے پیپل کا انتخاب فطری اور قدرتی عمل تھا۔

رسمِ دَھائی

اس رسم کو یہ نام اس لیے دیا گیا کیوں کہ اسے موت کے دسویں روز ادا کیا جاتا ہے۔ روح کی تجسیم کا جو تصوّر علمائے دین نے پیش کیا ہے، اس کے مطابق روحِ متوفی کو نیا جسم حاصل کرنے میں دس دن لگتے ہیں۔ اس لیے پسماندگان دسویں روز ''پنڈ دان'' کے ذریعے تجسیم کے اس عمل کو اختتام تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی موت کے باعث پیدا ہوئی گھر کی ناپاکی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

موت کے دسویں روز گھر کے افراد، مع عزیز و اقارب، شمشان جا کر پنڈ دان کرتے ہیں اور اس کے بعد کسی قریبی مندر، ڈیرے، چاہ یا تالاب پر جا کر نہاتے ہیں۔ اس رسم کا مقصد پسماندگان کو یہ سمجھانا ہے کہ موت سے پیدا شدہ ناپاکی ختم ہو گئی ہے اور وہ پھر سے اپنا معمول شروع کر سکتے ہیں۔ اکثر علاقوں میں موت کے دن ہی سے پسماندگان سر اور داڑھی منڈوانا بند کر دیتے ہیں۔ دہائی کی رسم میں سر اور داڑھی مونڈ کر ماتم کے خاتمہ اور معمول کی زندگی کے

آغاز کا علامتی اعلان کیا جاتا ہے۔ بعض علاقوں میں اس رسم کو ''دہائی نہانا'' یا ''دساہی اشنان'' بھی کہا جاتا ہے۔

رسمِ بدالتجا

اس رسم کے اجرا میں جو جذبہ کارفرما رہا ہے وہ ہے بیٹی کے بیوہ ہو جانے کی صورت میں اس کے میکے والوں کا اسے حوصلہ اور مالی امداد دینا۔ چوں کہ میکے کی طرف سے یہ امداد کسی نیک وقت پر نہیں بلکہ ایسے وقت پر دی جاتی ہے جب بیٹی کے لیے بہت برا وقت درپیش ہوتا ہے، اس لیے اسے عرفِ عام میں ''برے کی رسم'' کہا جاتا ہے۔

اس رسم میں میکے کے لوگ بیٹی کے سسرال جاتے ہیں اور وہاں کی محوِ آہ و بکا عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی بیوہ پر سفید چادر پھینکتے ہیں۔ امداد کے طور پر نقدی اور دوسری چیزیں بھی اسی طرح روتے دھوتے پھینکی جاتی ہیں۔ یہ رسم بھی دیگر رسوم کی طرح علامتی رسم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بیٹی کی اس مصیبت کی گھڑی ہی میں نہیں بلکہ اس کی بقیہ زندگی میں بھی میکے والے حسبِ توفیق اس کی مدد کرتے رہیں گے۔

~~~~~~
~~~~~~

باب-۵

سکھ معاشرے کی رسومات

جس زمانے میں سکھوں کے دسویں گورو، گوبند سنگھ نے اپنے مریدوں کو ''خالصا'' کا لقب عطا کر کے سکھ سماج کی بنیاد ڈالی تھی، اس زمانے میں ہندو معاشرہ طرح طرح کے رسم ورواج میں الجھا ہوا تھا۔ تقدیسِ ادائگی رسوم میں مذہب کے نام پر براہمنوں کا بول بالا تھا اور براہمنوں نے اپنے مفاد کے لیے اوہام پرستی کا جال پھیلایا ہوا تھا۔ گورو صاحب نے نورستہ سکھ معاشرے کو ہندوؤں کے کرم کانڈ سے نجات دلانے کے لیے ذاتوں کے نظامِ کہنہ (ورنا شرم) کو ختم کر کے تمام سکھوں کو برابری کا درجہ عطا کر دیا۔ برابری کی اس لہر نے ہندو معاشرے کی پامال اور تاراج عورت کو بھی مردوں سے پیچھے نہ رہنے دیا اور اسے بھی مردوں کے برابر کا حق مل گیا۔ گورو گوبند سنگھ نے براہمن جماعت کی اہمیت پر ایک اور ضربِ کاری لگاتے ہوئے مذہبی کتاب ''گرنتھ صاحب'' کو گورو کا درجہ دے کر یہ اعلان کر دیا کہ یہ مقدس گرنتھ دسوں گوروؤں کی تجسیم ہے۔ ان کی ہدایت ہے کہ تمام سکھ اس مقدس کتاب کو ''پرگٹ گوراں کی دیہہ'' تسلیم کریں۔ جس معاشرے کے پاس ایک کتاب پیشوائے دین کے مجسمے کے طور پر موجود ہو، ظاہر ہے کہ اس معاشرے کی تمام رسومات میں اس کتاب کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ سکھ معاشرے کی رسموں میں جو اہمیت گورو گرنتھ صاحب کو حاصل ہے، اس کی مثال شاید دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں دستیاب نہیں ہے۔

سکھ معاشرے کی بنیاد میں دوسری اہم چیز شمشیر رہی ہے چوں کہ سکھ معاشرے کی تشکیل ہی بہ زورِ شمشیر اور زیرِ سایۂ شمشیر کی گئی تھی، اس لیے مقدس کتاب کے بعد سکھ رسومات میں دوسرا اہم درجہ شمشیر (کرپان) کو حاصل ہوا۔ سکھ معاشرے میں مروّج رسوم مندرجہ ذیل ہیں۔

رسمِ پیدائش

سکھوں کے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو گھر کا کوئی بڑا بوڑھا ''مُول منتر'' کی تلاوت کے ساتھ تیغ (کرپان) کی نوک پر شہد لگا کر بچے کی زبان سے چھو دیتا ہے۔ اسے ''جنم سنسکار'' کہا جاتا ہے۔

رسمِ تسمیہ

بچے کی پیدائش کے چند روز بعد اسے کوئی نام دینا ہوتا ہے۔ اسے ''نام کرن سنسکار'' کہا جاتا ہے۔ اس رسم کی ابتدا گورو گرنتھ صاحب کے پاٹھ (تلاوت) سے ہوتی ہے۔ مقدس گرنتھ میں سے کوئی ایک مصرع پڑھا جاتا ہے۔ جس حرف سے یہ مصرع شروع ہوتا ہے، اسی حرف سے شروع ہونے والا نام بچے کو دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر حاضر لوگ (سنگت) مختلف نام تجویز کرتے ہیں اور بالآخر کسی ایک نام کا انتخاب کرلیا جاتا ہے۔ اس نام کا اعلان ''بھائی'' (قاری) کرتا ہے۔ نرینہ اولاد ہونے کی صورت میں نام کے ساتھ لفظِ ''سنگھ'' اور مادین کی صورت میں لفظِ ''کور'' جوڑ دیا جاتا ہے۔ ''آنند صاحب'' کی تلاوت کے بعد دعا (ارداس) کی جاتی ہے اور دیگ (کڑاہ پرشاد) کی نیاز کا حلوہ تقسیم کیا جاتا ہے۔

رسمِ خانہ آبادی

خانہ آبادی کا جو طریقہ ابتدائی سکھ معاشرے میں جاری ہوا تھا اسے ''آنند کارج'' کہا جاتا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں حکومت نے ''آنند میرج ایکٹ'' کے ذریعے اس طریقِ شادی کو قانونی طور پر تسلیم کرلیا۔

بچوں کے جوان ہونے پر ان کے والدین ان کی شادی طے کرتے ہیں۔ معینہ دن پر دولہا برات لے کر دلہن کے گھر پہنچتا ہے۔ دونوں خاندانوں کے سربراہ ''مِلنی کے اشلوک'' (کلماتِ ملاقات) گاتے ہوئے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں۔ اسے ''ملنی'' یعنی

ملاقات کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں خاندانوں کے افراد دولہا دلہن کو ساتھ لے کر گورو گرنتھ صاحب کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔ دلہن کو دولہا کی بائیں طرف بٹھایا جاتا ہے۔ گرنتھی (قاری) انھیں ازدواجی زندگی کے فرائض سے روشناس کراتا ہے۔ اس تلقین کے بعد دلہن کا باپ اس کا دامن دولہا کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ ازاں بعد ''چار لاواں'' پڑھی جاتی ہیں۔ ان کی تلاوت کے دوران دلہا دلہن مقدس گرنتھ کا طواف کرتے ہیں۔ دورانِ طواف دولہا آگے رہتا ہے اور دلہن اس کے پیچھے۔ اس کے بعد ''آنند'' پڑھا جاتا ہے اور دعا (ارداس) کی جاتی ہے۔ رسمِ خانہ آبادی کے اختتام پر دیگ کی نیاز کا حلوہ (کڑاہ پرشاد) تقسیم کیا جاتا ہے۔

رسمِ آتشزدگی

سکھوں میں اس رسم کو ''سنسکار'' یا ''داہ سنسکار'' کہا جاتا ہے۔ سکھ معاشرے میں جب کسی شخص کی موت ہونے لگتی ہے تو بجائے آہ و بکا کے ''سکھمنی صاحب'' کی تلاوت کے ذریعے پسماندگان خود کو، ذہنی طور پر، رضائے ربی قبول کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ مررہے شخص کو، ہندو معاشرے میں مروج رسم کے برعکس، نہ چارپائی سے نیچے اتارا جاتا ہے اور نہ کوئی دوسری رسم ادا کی جاتی ہے۔ موت کے بعد جسمِ خاکی کو غسل دے کر کفن پہنا دیا جاتا ہے اور اس کی ارتھی (جنازہ) کو شمشان لے جا کر چِتا میں جلا دیا جاتا ہے۔ بالعموم سب سے بڑا بیٹا ہی چِتا کو آگ دیتا ہے۔ جب چِتا جل اٹھتی ہے تو ''کیرتن سوہلا'' پڑھا جاتا ہے۔

رسمِ عظم اندوختی

رسمِ آتشزدگی کے چوتھے دن چِتا کی راکھ میں سے مردے کی ہڈیاں چنی جاتی ہیں۔ اسے ''پھُل چگنا'' کہتے ہیں۔ عام طور پر ان عظام کو کرت پور کے مقام پر دریائے ستلج میں بہایا جاتا ہے جسے ''پتالپوری پھُل پاؤنا'' (نذرِ تحت الثریٰ) کہتے ہیں۔

موت کے ساتویں، گیارہویں یا تیرہویں دن گورو گرنتھ صاحب کے پاٹھ (تلاوت) کا ''بھوگ'' (ختم) ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ماتم کا ماحول ختم ہو جاتا ہے اور زندگی پھر سے

معمول پر آ جاتی ہے۔

عام طور پر چتا کی راکھ کو بھی عظام کے ہمراہ دریا ہی میں بہا دیا جاتا ہے۔

ان تمام رسومات کے پس منظر میں سماجی ضرورتوں کو کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔ نئے قائم ہوئے معاشرے کو گورو گرنتھ صاحب کی سمت دے کر گورو گوبند سنگھ نے معاشرتی صدق کو کتابِ اقدس کی طرف رجوع کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سکھوں کی تمام تر رسومات گورو گرنتھ صاحب کے حضور ہی میں ادا کی جاتی ہیں۔ چوں کہ اس نورستہ معاشرے نے ہندو معاشرے کی قدیم رسومات سے احتراز کیا تھا، اس لیے قدرتی طور پر ہی ان رسومات کا سادگی اور مذہبیت سے آراستہ ہونا ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سکھوں کی ہر رسم میں گورو گرنتھ صاحب کا پاٹھ اور تبرک کی تقسیم کو لازمی قرار دیا گیا۔ ہندو معاشرے میں آگ کو بہت عظمت اور توقیر حاصل ہے چوں کہ آگ کو دیوتاؤں اور خاکی انسانوں کے درمیان ترسیل کا واحد ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی ہر رسم میں آگ کی پرستش کا جو چلن ہے، سکھ معاشرے میں اس کی صورت یہ ہوئی ہے کہ وہی مقامِ تقدیس گورو گرنتھ صاحب کو دے دیا گیا ہے۔

سکھ معاشرے کے رسم و رواج ہندو معاشرے کی رسوم سے الگ کوئی نئے رواج نہیں ہیں بلکہ ہندو معاشرے کے مروجہ رسم و رواج کا ہی تنقیحی سادہ روپ ہیں۔ سبب یہ ہے کہ چوں کہ سکھ معاشرہ ہندو معاشرے میں ہی سے تشکیل کیا گیا تھا اس لیے یہ قدرتی تھا کہ یہ معاشرہ اپنے قدیم ثقافتی ورثے سے احتراز نہ کرتا۔ سکھ معاشرے کے ابتدائی دور میں اس کی ضرورت بھی درپیش نہ تھی کہ اپنے تمدنی ورثے کو خیر باد کہا جائے بلکہ وقت کی ضرورت صرف اتنی تھی کہ اجتماعی اعمال پر جمی کرم کانڈ اور براہمن ازم کی دھول کو صاف کیا جائے۔

~~~~~~
~~~~~~

باب-٦

مسلم معاشرے کی رسومات

چوں کہ اسلام کے ظہور کے زمانے میں اخلاقی اور تہذیبی اعتبار سے عرب معاشرے کی حالت ناگفتہ بہ تھی، اس لیے اسلام کے ابتدائی دور میں جو رسمیں مسلم معاشرے میں رائج ہوئیں، انکے پیچھے دو مقاصد کام کر رہے تھے۔ اوّل یہ کہ ان رسموں کے ذریعے ایک صحت مند معاشرے کو منظم کیا جائے اور دوسرے یہ کہ ان کے ذریعے نورستہ معاشرے کو اخلاقی اقدار سے آراستہ کیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائی دور کے مسلم معاشرے کی رسومات سادہ، نمائش سے مبرّا اور مائل بہ مذہب ہوتی تھیں۔ لیکن جیسے جیسے اسلام عرب کی حدوں سے باہر نکل کر دینا کے مختلف ممالک میں پھیلتا گیا ویسے ویسے ہر ملک کی مقامی رسومات اسلامی رسموں کو متاثر کرتی رہیں۔ ہندوستان میں چوں کہ بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جنھوں نے اپنا پیدائشی مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا، اس لیے وہ لوگ اسلامی رسومات کے ساتھ ساتھ اپنے آباواجداد کی رسمیں بھی ادا کرتے رہے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نکاح کی خالص اسلامی رسم کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مسلم معاشرے میں دولہا کا گھوڑی چڑھنا، تلوار لے کر چلنا، دلہن کا ڈولی میں وداع ہونا اور ڈولی پر سے پیسوں کا صدقہ جیسی کتنی ہی مقامی رسومات مروّج چلی آرہی ہیں۔ باوجود ان مقامی رسموں کی مقبولیت کے ہندوستانی معاشرے میں اہلِ اسلام کے ہاں وہی رسمیں قابلِ تقدیس تصور کی جاتی ہیں جو کبھی عرب معاشرے میں رائج کی گئی تھیں۔ ذیل میں ہندوستانی مسلم معاشرے کی بنیادی رسومات کا ذکر کیا جائے گا۔

رسمِ اوّل اذان

مسلم سماج میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلے اسے نہلا دھلا کر پاک کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد گھر کا کوئی بزرگ اس کے کان میں اذان دیتا ہے۔ بچہ چوں کہ پہلی بار اذان سنتا ہے، اس لیے اس ''اوّل اذان'' کہا جاتا ہے۔ اذان کے یہ بول اَللّٰهُ اَکْبَرُ. اَشْهَدُ اَنْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ. حَیَّ عَلَی الصَّلٰوةِ. حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ بچے کو اسلام کی طرف آنے کی دعوت دیتے ہیں اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اذان سن کر بچہ مسلمان ہو گیا ہے۔

رسمِ عقیقہ

بچے کی پیدائش کے ساتویں دن بچے کے نام پر کسی جانور کی قربانی دی جاتی ہے جسے عقیقہ کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے بچے کی پیدائش کے ساتویں دن یہ رسم ادا نہ کر سکے تو وہ اسے کبھی بھی ادا کر سکتا ہے لیکن جب بھی وہ بچے کا عقیقہ کرے گا، اس کے لیے اسے اسی دن کا انتخاب کرنا ہوگا جو بچے کی پیدائش کے حساب سے ساتواں روز پڑتا ہو۔ مثلاً اگر بچہ پیر کے روز پیدا ہوا ہے تو اس کا عقیقہ چاہے کبھی بھی ہو مگر ہوگا اتوار کے دن ہی۔ اولاد اگر نرینہ ہو تو دو بکریوں یا دو بھیڑوں اور اگر مادین ہو تو ایک بکری یا ایک بھیڑ کی قربانی دی جاتی ہے۔ عام طور پر عقیقہ کے دن بچے کے سر کے بال اتارے جاتے ہیں اور بالوں کے وزن کا سونا یا چاندی خیرات کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد عقیقے کا گوشت رشتہ داروں، بھائی چارے اور غریبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

رسمِ ختنہ

بچہ جب ذرا بڑا ہو جاتا ہے تو نائی کو بلوا کر اس کے عضوِ تناسل کے اوپر کا گوشت کٹوایا جاتا ہے۔ اسے ''ختنہ کرنا'' یا ''سنّت کرنا'' کہتے ہیں۔ چوں کہ ہندوستان میں ختنہ کے ذریعے مسلمانوں کو جسمانی طور پر باقی لوگوں سے مختلف پہچان حاصل ہوتی ہے اس لیے عرفِ عام میں اس رسم کو ''مسلمانی'' یا ''مسلمان کرنا'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس رسم کے آخرالذکر دونوں نام غلط العام ہیں چوں کہ بچہ اوّل اذان کے ساتھ ہی مسلمان ہو جاتا ہے۔

اس موقع پر بچے کو نہلا دھلا کر تیار کیا جاتا ہے۔ ختنہ کے بعد اس کے جسم کے نچلے حصے پر سرخ

کپڑا ڈال دیا جاتا ہے۔ اس تقریب میں شریکے بھائے چارے کا بچّے کو شگون سلامی دینا بھی مروّج ہے۔

رسمِ نکاح

مسلم معاشرے میں بچوں کے جوان ہونے پر ان کے والدین ان کی شادی طے کرتے ہیں۔ چوں کہ مسلم معاشرے میں سگے بہن بھائی کو چھوڑ کر باقی کے اکثر رشتوں میں شادی کی جاسکتی ہے، اس لیے عام طور پر ازدواجی نسبتیں بچوں کی کم عمری ہی میں طے ہو جاتی ہیں۔ ہندو معاشرے کی مروّجہ رسم کے برعکس مسلم معاشرے میں لڑکی والے لڑکا تلاش نہیں کرتے بلکہ شادی کی پیش کش لڑکے والوں ہی کو کرنا ہوتی ہے۔

نکاح کے روز دولہا برات لے کر دلہن کے گھر پہنچتا ہے۔ مسلم معاشرے میں چوں کہ شادی کو سماجی اقرار کے طور پر لیا گیا ہے، اس لیے نکاح کے وقت یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے شوہر کبھی اپنی بیوی کو طلاق دے گا، تو اسے کتنی رقم ادا کرنا ہوگی۔ اسے ''مہر'' کہا جاتا ہے۔ دولہا اور دلہن جب اظہارِ رضا مندی کر کے اس اقرار کو قبول کر لیتے ہیں تب مولوی نکاح پڑھواتا ہے۔ نکاح کے موقعے پر خرما کی تقسیم (چھوارے لٹانا) اور نکاح کے بعد دعوتِ ولیمہ (طعامِ عروسی) بھی مسلم معاشرے میں مروّج ہیں۔ نکاح کے وقت دو مسلمان گواہوں کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ شیعہ معاشرے میں نکاح کے وقت تو نہیں البتہ طلاق کے وقت دو گواہوں کی موجودگی کو لازمی مانا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں نکاح کے اقرار کو زبانی طور پر قبول کرنے کے ساتھ ساتھ تحریری طور پر بھی محفوظ کیا جاتا ہے۔ اس تحریر کو ''کابین نامہ'' کہتے ہیں۔

رسمِ تدفین

مسلم معاشرے میں کسی کی موت پر آہ و بکا کرنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ موت واقع ہونے پر مردے کو غسل دے کر پاک کیا جاتا ہے اور اسے کفن پہنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے جنازے کو قبرستان لے جایا جاتا ہے، جہاں سب سے پہلے نمازِ جنازہ ادا کی جاتی ہے۔ نماز کے بعد مردے کو قبر میں اتارا جاتا ہے۔ قبر کو مستطیل خندق کی صورت میں تیار کیا جاتا ہے جس کی مغربی دیوار میں لحد بنائی جاتی ہے۔ مردے کو لحد میں لٹانے کے بعد لحد کو شکستہ گھڑوں،

اینٹوں اور گیلی مٹی سے بند کر دیا جاتا ہے۔ ازاں بعد قبر کی خندق کو مٹی سے بھر دیا جاتا ہے۔ تدفین کی اس رسم میں تین باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی یہ کہ جنازے کے ساتھ جانے والا ہر مسلمان جنازے کو کاندھا دیتا ہے۔ دوسری یہ کہ جنازے میں شریک ہر مسلمان نمازِ جنازہ میں شامل ہوتا ہے اور تیسری یہ کہ تدفین کے وقت موجود ہر مسلمان قبر میں مٹی ڈالنے میں شریک ہوتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو ان تمام رسموں کے پس منظر میں عرب کے جغرافیائی اور سماجی حالات کارفرما نظر آتے ہیں۔ اذان دے کر بچّے کو اسلام میں داخل کیا جاتا ہے۔ عقیقہ کے ذریعے بچہ پیدا ہونے کی خوشی میں معاشرے کو شریک کیا جاتا ہے۔ عرب چوں کہ ہندوستان کی طرح زراعتی ملک نہیں تھا، اس لیے وہاں کسی خوشی میں دوسروں کو شریک کرنے کے لیے گوشت ہی تقسیم کیا جاسکتا تھا۔ ختنہ سے کثرتِ اولاد کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ اس زمانے کے عرب معاشرے میں اور بالخصوص نورستہ اسلامی سماج میں کثرتِ اولاد کو خدا کی نعمتِ خاص تصور کیا جاتا تھا۔ اسلام کے ظہور سے پہلے عرب معاشرے میں عورت کی حیثیت ایک غلام کی سی حیثیت تھی جو مرد کے ہاتھ کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔ ایک صحتمند معاشرے کی تنظیم کے لیے یہ ضروری بھی تھا اور مناسب بھی کہ شادی کے ادارے کو سماجی اقرار کی صورت عطا کر کے ازدواجی زندگی میں طلاق کی بھی گنجائش نکالی جائے۔ یہ گنجائش نکالنا اگرچہ اس زمانے کے قبائلی سماج کی صحت کے لیے ضرورت تھا لیکن یہاں یہ خیال بھی خاص طور سے رکھا گیا کہ طلاق شدہ عورت کو مالی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اسی خیال کی بنا پر کثیر الازدواج کو جائز قرار دیتے ہوئے بھی اسلام نے اسی صورت میں دوسری بیوی لانے کو جائز قرار دیا ہے جب کہ پہلی بیوی اس کی منظوری دے۔ سماج کی بہتر تنظیم کے لیے یہ ضروری تھا کہ عورت کو صرف ذریعۂ تسکینِ نفس ہی نہ سمجھا جائے بلکہ اسے مرد کی شریکِ حیات بننے کا موقع دیا جائے۔

اگرچہ قرآنِ حکیم میں مردے کی تدفین کو قیامت کے ساتھ وابستگی دے کر اس عمل کو روحانیت کے اعتبار سے ایک فلسفہ قرار دیا گیا ہے لیکن اس کی بنیاد میں بھی عرب کے جغرافیائی حالات کی موجودگی کو صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ عرب میں نہ تو دریا ہی تھے کہ مردے کو نذرِ آب کیا جاسکتا اور نہ اتنی لکڑی کہ اسے نذرِ آتش کیا جاسکتا۔ لے دے کر مردے کی مٹی ٹھکانے لگانے کا ایک ہی طریقہ سامنے تھا کہ اسے زیرِ زمین دفنا دیا جائے۔

~~~~~~
~~~~~~

باب-۷

عیسائی معاشرے کی رسومات

عیسائی معاشرے میں روح کی پاکیزگی پر بہت زور دیا گیا ہے، اس لیے عیسائی معاشرے کی تمام رسومات میں کسی نہ کسی صورت میں، پانی کا استعمال لازمی ہوگیا ہے۔ ان رسومات میں دوسری اہم چیز یہ ہے کہ ان میں تحریری الفاظ کو بہت وقیع مانا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان رسومات کے جاری کیے جانے کے پیچھے ایک صحتمند اور باضابطہ معاشرے کی تنظیم کا مقصد موجود رہا ہے۔ پانی کے ذریعے خود کو اور اپنے ماحول کو پاک کرنے کے بعد عیسائی لوگ جو بھی رسومات ادا کرتے ہیں، انھیں تحریری طور پر مستند کرلیا جاتا ہے۔ ہندوستانی عیسائی معاشرے کی قابلِ ذکر رسومات مندرجہ ذیل ہیں۔

رسمِ بپتما

عیسائی معاشرے میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے نہلا دھلا کر پاک کیا جاتا ہے اور عیسائی بنایا جاتا ہے۔ عیسائی بننے کے بعد ہی حلقۂ عیسائیت (کلیسیا) میں اس کا داخل ہونا ممکن ہوتا ہے۔ اس دن بچے کو سفید کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ سفید رنگ پاکیزگی کی علامت ہے۔ سب سے پہلے پادری کی رہنمائی میں بچے کے حق میں درازیٔ عمر کی مخصوص دعا کی جاتی ہے۔ اس اجتماعی دعا کے بعد بچے کی تمام تر ذمہ داری اس کے والدین کو سونپی جاتی ہے۔ اس ذمہ داری میں والدین کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ بچے کو نیک و بد میں تمیز کرنا سکھائیں گے اور اسے خدا کی طرف راغب کریں گے۔ والدین کے ذمہ داری کو قبول کرنے پر پادری پانی کا ایک لوٹا لے کر پانی کو پاک (بلیس) کرتا ہے۔ دعا پڑھنے کے بعد پادری اس آبِ پاک سے بچے کے ماتھے پر ''کراس'' بناتا ہے اور اسے سعادت بخش کر والدین کے حوالے کرتا ہے۔ ''پینی

کاتسلوں'' میں اس موقع پر بچّے کو اس آبِ پاک میں غوطہ (ڈِپ کرنا) دینے کا رواج ہے، جسے اصطباغ دینا کہا جاتا ہے۔ اس طریقے سے بچّے کی ''کرسننگ'' ہو جاتی ہے۔ اس خوشی کے موقع پر مختلف علاقوں میں مقامی رواج کے مطابق مٹھائی تقسیم کرنے، چائے پارٹی دینے یا مقامی حلقۂ عیسائیت کو کھانا دینے کا چلن بھی عام ہے۔ رسمِ بپتما میں پادری کی طرف سے ایک تحریری سند بھی جاری کی جاتی ہے کہ فلاں بچّے کا بپتما اس کی موجودگی میں ہوا ہے۔ سہولت کے مطابق اس رسم کو گھر پر بھی ادا کیا جا سکتا ہے اور گرجا میں بھی اس کا انعقاد کیا جا سکتا ہے۔

عیسائی معاشرے میں اس رسم کو وہی درجہ اور وہی اہمیت حاصل ہے، جو درجہ اور جو اہمیت مسلم معاشرے میں ''اوّل اذان'' کو یا ہندو معاشرے میں ''اُپنین سنسکار'' کو حاصل ہے۔ عیسائی معاشرے میں صرف ''سالویشن آرمی'' والوں کے ہاں اس رسم کو مختلف معنی میں ادا کیا جاتا ہے۔ ان کے مطابق اس رسم کا مقصد بچّے کو عیسائی بنانا نہیں ہے، بلکہ اسے خدا کی تحویل میں دینا ہے۔ ان کے ہاں، مخصوص دعا کے ذریعے اس رسم میں بچّے کو خدا سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ چوں کہ حضرت عیسیٰ مسیح نے خود کسی کا بپتسما نہیں کیا تھا اور چوں کہ حضرت خود یوحنا کے ہاتھ سے بپتائز ہوئے تھے، اس لیے کوئی پادری کسی بچّے کو عیسائی نہیں بنا سکتا۔ وہ صرف بچّے کو منسوب بہ الٰہی کر سکتا ہے۔ عیسائی تو وہ خود بالغ ہونے پر، اپنی مرضی سے بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بِپٹی کاتسلوں میں بچّے کی رسمِ بپتسما اس کے بالغ ہونے پر ہی ادا کرنے کا رواج ہے۔

رسمِ تصدیق

جن عیسائیوں کے ہاں بچّے کا بپتسما کرنے کا رواج ہے، ان کے ہاں اس کے بالغ ہونے پر رسمِ تصدیق (کانفرمیشن) کی جاتی ہے۔ اس رسم کے دو مقاصد ہیں۔ اول یہ کہ بالغ ہونے پر آدمی خود یہ تصدیق کرے کہ جس مذہب میں اس کے والدین نے اس کو داخل کیا تھا، اس پر اس کا مکمل اعتقاد ہے۔ دوم یہ کہ اس رسم کے ذریعے والدین اس ذمہ داری سے سرخ رو ہوتے ہیں جو انھوں نے بچّے کے بپتسما کے وقت اپنے سر لی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس رسم میں بالغ یہ اعلان کرتا ہے کہ اسے عیسائیت پر مکمل اعتقاد ہے، وہ حضرت عیسیٰ مسیح پر ایمان لاتا ہے اور وہ اس ذمہ داری کو، جس کے ذریعے اس کے والدین نے اسے نیک و بد میں امتیاز کرنا سکھا کر

خدا کی طرف راغب کرنے کا اقرار کیا تھا، آئندہ کے لیے خود اپنے سر لیتا ہے۔

رسمِ تصدیق کے دن عزیز و اقارب کو گھر پر مدعو کر کے پادری کو گھر پر لایا جاتا ہے۔ پادری بالغ ہوئے شخص سے حضرت عیسیٰ مسیح، عیسائیت اور خدا سے متعلق چند سوالات پوچھ کر یہ یقین کرتا ہے کہ وہ اب اس قابل ہو گیا ہے کہ از خود فرائضِ دینوی کو ادا کر سکے۔ اس کا یقین ہو جانے پر پادری اس کے نام سندِ تصدیق جاری کر کے اس سے یہ عہد کراتا ہے کہ وہ مستقبل میں بھی اسی طرح اپنے مذہب پر پابند اور مذہبی احکام کی تعمیل میں ثابت قدم رہے گا۔ اس کے بعد اجتماعی دعا کی جاتی ہے۔ پادری اسے دعائے سعادت سے نواز کر اس کا تعارف حلقۂ عیسائیت کے معمر اراکین سے کراتا ہے۔ اس رسم کے بعد وہ ''ہولی کمیونین'' میں شریک ہو سکتا ہے۔

اگر چہ ''رومن کیتھولکوں'' میں رسم تصدیق سے پہلے ہی بچوں کو ''ہولی کمیونین' میں شامل کرنے کا رواج ہے لیکن ''پروٹیسٹینٹوں'' میں ''ہولی کمیونین'' میں شامل ہونے کا حق اس وقت تک آدمی کو حاصل نہیں ہوتا جب تک اس کی رسمِ تصدیق نہ ہو جائے۔ اس رسم کے آخری حصے میں مقامی رواج کے مطابق چائے پارٹی یا کھانا دے کر معاشرے کو اپنی خوشی میں شریک کیا جاتا ہے۔

رسمِ خانہ آبادی

جہاں کہیں بھی عیسائی بچوں کے درمیان شادی کا معاملہ طے ہوتا ہے، وہاں کے گرجا گھر میں اس مجوزہ نسبت کا اعلان تین مختلف مجلسوں میں کیا جاتا ہے۔ اس سے غرض یہ ہے کہ اگر اس نسبت پر معاشرے کے کسی فرد کو کوئی اعتراض ہو تو اس پر غور کیا جا سکے۔ تین اعلانوں کے بعد، معینہ تاریخ پر، دولہا برات لے کر گرجا گھر آتا ہے جہاں دلہن کے والدین مع عزیز و اقارب پہلے ہی سے ان کے منتظر ہوتے ہیں۔ لڑکی والوں کی طرف سے برات کی اگوانی کے بعد پہلے لڑکے والے گرجے میں داخل ہوتے ہیں، پھر لڑکی والے۔ اس موقع پر دولہا تو اپنی من پسند پوشاک پہن سکتا ہے لیکن دلہن کو، پاکیزگی کی علامت کے طور پر، سفید لباس ہی زیب تن کرنا ہوتا ہے۔

گرجا گھر میں داخل ہونے کے بعد دولہا اور دلہن کے والدین پادری کو تصدیق نامہ پیش کرتے

ہیں کہ دولہا اور دلہن دونوں غیر شادی شدہ اور بالغ ہیں۔ پادری دولہا دلہن سے ایک دوسرے کے تئیں محبت اور اعتماد کا اقرار لیتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کنیادان کون کرے گا؟ عام طور پر دلہن کا والد ہی کنیا دان کرتا ہے۔ اس کے بعد پادری ایک بار پھر اس نسبت کا اعلان کرتا ہے تاکہ یہ یقین کرلیا جائے کہ وہاں کے عیسائی سماج میں کسی شخص کو اس شادی پر کوئی عذر نہیں ہے۔ اس آخری اعلان کے بعد معاشرے کے کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اس رشتے پر نکتہ چینی کرے۔ معاشرے کی خاموش منظوری کے بعد دولہا دلہن ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنا کر میاں بیوی بن جاتے ہیں۔ مجلس میں موجود لوگ اجتماعی دعا کے ذریعے ان کی خوشحال ازدواجی زندگی کے لیے دستِ دعا دراز کرتے ہیں۔ اس دعا کے بعد پادری شادی کا اعلان کرکے میاں بیوی کو دعائے خیر دیتا ہے۔ ازاں بعد لڑکا اور لڑکی دونوں شادی سے متعلق تصدیق نامہ پر دستخط کرتے ہیں۔

ازدواجی رشتے میں بندھنے کے بعد جب دولہا اور دلہن گرجے سے باہر آرہے ہوتے ہیں تو وہاں پر موجود لوگ ان پر پھول یا چاول برساتے ہیں، اور علامتی طریقے سے اس رشتے کو اپنی منظوری دیتے ہیں۔

اکثر علاقوں میں شادی سے پہلے ''منگنی'' کا بھی رواج ہے۔ شادی کے بعد ''میرج پارٹی'' اور ''جہیز'' کی رسمیں بھی عام طور پر مروّج ہیں۔ ''میرج پارٹی'' کی عوام میں مقبول رسم کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ عام طور پر اس پارٹی کا انتظام تو لڑکی والے ہی کرتے ہیں لیکن اس کے تمام اخراجات لڑکے والوں کو ادا کرنے ہوتے ہیں۔ پارٹی میں دولہا اور دلہن مل کر 'کیک' کاٹتے ہیں۔ اس موقع پر لڑکی کا والد کیک کٹائی کا تحفہ بھی پیش کرتا ہے۔ متعدد علاقوں میں شادی کے بعد ''وداعی'' کی رسم بھی مروّج ہے۔ وداعی کے موقع پر اجتماعی دعا کی جاتی ہے۔ اور لڑکی کو جہیز دے کر وداع کیا جاتا ہے۔

رسمِ تدفین

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ عیسائی کبھی مرتا نہیں ہے بلکہ موت کے توسل سے اس کی روح اس کے جسمِ خاکی کو چھوڑ کر حیات لامتناہی میں داخل ہوتی ہے۔ اس لیے عیسائی معاشرے میں کسی کی موت پر آہ و بکا کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ موت کے واقع ہوتے ہی عیسائی معاشرہ یادِ الٰہی

اور ذکرِ الٰہی کے ذریعے دعائیہ ماحول پیدا کرلیتا ہے۔ موت اگر گھر میں واقع ہوئی ہو تو پادری کو گھر پر مدعو کیا جاتا ہے اور دوستوں، رشتہ داروں اور سماج کے لوگوں کو اطلاع بھجوا دی جاتی ہے۔ پادری مرنے والے کے حق میں مخصوص دعا پڑھتا ہے جس کے بعد مردے کو ''کوفن'' (لکڑی کا بکس) میں رکھ دیا جاتا ہے۔ متعدد علاقوں میں کوفن کو گرجا گھر لے جانے کا بھی رواج ہے، جہاں دعائے مرگ (فیونرل سروس) ادا کی جاتی ہے۔ دعائے مرگ کے بعد کوفن کو اُٹھا کر قبرستان لے جایا جاتا ہے۔ عیسائیوں میں مردے کو لکڑی کے بکس میں بند کرنا اس قدیم روایت کا بدلا ہوا روپ ہے جب مردے کو دو چٹانوں کے بیچ لٹا کر تیسری چٹان سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ جنازے کے جلوس میں پادری سب سے آگے چلتا ہے۔ قبرستان پہنچ کر لوگوں کو مرنے والے کا آخری دیدار کرایا جاتا ہے اور پھر بکس میں کیلیں ٹھونک کر بکس کو اچھی طرح سے بند کر دیا جاتا ہے۔ دعاؤں کے سایہ میں بکس کو قبر میں اتار دیا جاتا ہے۔

عام طور پر کوفن کا رنگ سیاہ ہوتا ہے لیکن اگر مرنے والا غیر شادی شدہ لڑکا، غیر شادی شدہ لڑکی یا ضعیف العمر بزرگ ہو تو کوفن سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ تدفین کے بعد آخری دعا پڑھی جاتی ہے۔ اکثر علاقوں میں متوفی کی آتما کی شانتی کے لیے 'یادگاری دعائیہ مجلس'' (میموریل سروس) کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔

ان تمام رسومات کے پس منظر میں دو اہم سماجی ضرورتوں کا موجود ہونا دکھائی دیتا ہے۔ پہلی یہ کہ عیسائی معاشرہ ان رسومات کے ذریعے افرادِ کلیسہ کو عیسائی مذہب کے تئیں بار بار عقیدت مند بناتا رہتا ہے اور دوسری یہ کہ ان کے ذریعے ایک باضابطہ صحت مند معاشرہ تشکیل ہوتا رہتا ہے۔ بپتسما اور تصدیق کے ذریعے بچّے کو والدین کے حسب خواہش ہی نہیں بلکہ خود اس کے بالغ ہونے پر اس کی اپنی مرضی سے عیسائی معاشرے میں داخل کیا جاتا ہے۔ رسمِ تصدیق کے دوران لڑکے کو معاشرے کے برگزیدہ افراد سے متعارف کرانا دراصل اسے اس کی سماجی ذمہ داریوں کے بارے میں باخبر کرنا ہی ہے۔ اسی طرح شادی سے پہلے اور شادی کے وقت معاشرے کی منظوری طلب کرنا اور اگر کسی کو کوئی عذر ہو تو اس پر غور کرنا عیسائی معاشرے کی صحت کی علامت ہے۔



پیدائش: ☆ ۷؍نومبر ۱۹۴۲ء

تعلیم: ☆ ایم.اے (اردو-ہندی)، پی ایچ.ڈی

پتہ: ☆ پروفیسر وصدر، شعبۂ جدید ادب، پنجاب یونی ورسٹی، چنڈی گڑھ-۱۶۰۰۱۴

انعامات واعزازات:

☆ یوپی اردو اکادمی کی طرف سے ان کی کتاب ''خوشبو کا سفر'' کے لیے-۱۹۸۰ء

☆ آل انڈیا میر اکادمی کا ''امتیازِ میر'' ایوارڈ-۱۹۸۱ء

☆ مغربی بنگال اردو اکادمی کی طرف سے ان کی کتاب ''بند دروازہ'' کے لیے-۱۹۸۱ء

☆ پنجاب سرکار کی طرف سے ان کی کتاب ''بند دروازہ'' کے لیے-۱۹۸۲ء

☆ یوپی اردو اکادمی کی طرف سے ان کی کتاب ''ادب کی پرکھ'' کے لیے-۱۹۸۴ء

☆ آل انڈیا میر اکادمی کی طرف سے ان کی کتاب ''خوشبو کا سفر'' کے لیے-۱۹۸۶ء

☆ یوپی اردو اکادمی کی طرف سے ان کی کتاب ''پتھروں کا شہر'' کے لیے-۱۹۸۷ء

☆ بہار اردو اکادمی کا کل ہند ایوارڈ برائے ادبی خدمات-۱۹۸۹ء

☆ یوپی اردو اکادمی کی طرف سے ان کی کتاب ''کستوری کنڈل بسے'' کے لیے-۱۹۹۰ء

☆ آئی بی سی، کیمبرج کا خصوصی اعزاز مجموعی ادبی خدمات کے لیے-۱۹۹۸ء

☆ غالب ایجوکیشنل سوسائٹی کا ''غالب ایوارڈ''-۱۹۹۹ء

☆ میوزک ورلڈ، برمنگھم، انگلینڈ کا ''پوئٹ آف دی ملینیم ایوارڈ''-۲۰۰۰ء

☆ اے بی آئی، امریکہ کا ''مین آف دی ایئر ایوارڈ''-۲۰۰۱ء

☆ آئی بی سی، کیمبرج کا ''انٹرنیشنل ایجوکیٹر ایوارڈ''-۲۰۰۴ء